اطاعتِ رسول ﷺ کا جذبہ!

جناب عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص کی اُنگلی میں سونے کی انگوٹھی دیکھی۔ آپ ﷺ نے اسے اتار کر پھینک دیا اور فرمایا:

((يعمد أحدكم إلى جمرة من نار فيجعلها في يده.))

''(سونے کی انگوٹھی پہننا اس طرح ہے گویا) کوئی شخص قصداً آگ کے انگارے کو لے اور اسے اپنے ہاتھ میں رکھ لے۔''

جب آپ ﷺ (یہ فرما کر) تشریف لے گئے تو انگوٹھی کے مالک کو کہا گیا کہ اپنی انگوٹھی اُٹھالو اور کسی اور صورت میں اس سے فائدہ حاصل کرلو۔ وہ کہنے لگا: بخدا! میں اسے کبھی بھی نہ اُٹھاؤں گا جسے رسول اللہ ﷺ نے خود پھینکا ہو۔ (صحیح مسلم، حدیث نمبر: ۲۰۹۰)

استخلاف فی الارض کا وعدہ

دین کے معنیٰ اسلامی نقطہ نگاہ سے کامیابی کے کامل پروگرام کے ہیں، اس لیے جو لوگ صحیح معنوں میں مومن ہوں گے اور ان کے اعمال اللہ کے تجویز کردہ پروگرام کے ماتحت ہوں گے، ان کا دنیا و آخرت میں کامیاب ہونا یقینی اور حتمی ہے۔ اس آیت (سورت نور، آیت: ۵۵) میں قرآن نے اسی اُصول کی جانب راہ نمائی فرمائی ہے۔ ارشاد ہے کہ مومنین سے اللہ کا وعدہ ہے کہ انھیں خلیفہ فی الارض یعنی ملک کا حاکم بنایا جائے گا، انھیں دنیا کی تمام نعمتوں سے نوازا جائے گا اور ان کے سر پر تاج خسروی رکھا جائے گا اور ان کے لیے یہ مقدرات میں سے ہے کہ جب تک اسلام کی پوری پابندی کرتے رہیں اس وقت تک دنیا کی قیادت کریں، سب سے بلند رہیں اور اللہ کے فضل سے ساری کائنات پر حکومت کریں۔

کیوں کہ اسلام کے لائحہ عمل میں ایسے رفعت آگین اور تفوق آفرین اُصول داخل ہیں کہ ان پر عمل پیرا ہونے کا یہی قطعی اور منطقی نتیجہ ہے جو مذکور ہوا۔ اور یہ صرف نظریہ ہی نہیں بلکہ اسلام کی ساری تاریخ اس پر شاہد عدل ہے۔ دیکھ لیجیے جب تک مسلمان صحیح معنوں میں مسلمان رہے، ان کے دلوں میں احساسِ عزت کا جذبہ موج زن رہا، اسلام کے حاکمانہ اُصول ان کی زندگی میں کارفرما رہے اور جب تک اُنھوں نے قیادت وراہ نمائی کے منصب جلیل پر اپنے کو فائز رہنے کا حق دار سمجھا، تب تک حاکم رہے، عزت واقتدار کے مالک رہے اور رونق اورنگ وتاج رہے۔ اور جب سے مذہب کے معنی ان کے ہاں خشک قیود اور بے روح رسموں کے اور محض انتساب کو باعث فخر ومباہات سمجھا گیا تو اُس وقت سے ذلت وادبار اک دورِ مشئوم شروع ہوا۔ ورنہ مسلمان اور غلامی، مسلمان اور افلاس، مسلمان اور ذلت وتحقیر، شیئـان یستفرقان ای تفرق! یہی نسخہ کیمیا تو تھا جس نے مریض عربوں کو صحت وتوانائی بخشی، جس نے زیردستوں کو زبردست بنا دیا، جس کی وجہ سے جہالت تعلیم سے بدل گئی اور بداخلاق قوم سرخیل روحانیات ٹھہری۔ یہی تو وہ اسلام ہے جس کی وجہ سے مٹھی بھر مسلمان کائنات پر چھا گئے اور لوگوں کی راہ نمائی کرنے لگے۔ پھر آج اگر ہم میں ذہنی افلاس موجود ہے تو اسلام اور قرآن اس کا ذمہ دار نہیں۔ بلکہ اس کی ساری ذمہ داری ہمارے اپنے اعمال اور کردار پر عائد ہوتی ہے۔

وعدۂ استخلاف کے بعد اگلی آیت میں نہایت جامعیت کے ساتھ وہ پروگرام بتلایا ہے جس پر عمل پیرا ہونے سے خلاف ونیابتِ الٰہیہ کا منصب حاصل ہوسکتا ہے اور وہ پروگرام نماز اور زکات کی تنظیم ہے، رسول کی اطاعت اور فرماں برداری ہے۔ مسلمان اگر نماز کی روحانی واجتماعی برکات سے آگاہ ہو جائیں اور زکات کی تنظیم کرلیں اور یہ طے کرلیں کہ ان کی زندگی اسوۂ رسول کے مطابق ہوگی تو یقین جانیے، آج ہی ان کی ہر قسم کی ذلتیں اور نحوستیں، عزتوں اور سعادتوں سے بدل سکتی ہیں۔ (مولانا محمد حنیف ندوی رحمہ اللہ)



بسم اللہ الرحمن الرحیم

واعتصموا بحبل اللہ جمیعا ولا تفرقوا

بانی مولانا محمد عطاء اللہ حنیف رحمہ اللہ
سرپرست مولانا ابوبکر صدیق السلفی حفظہ اللہ

17 جمادی الثانی 1435ھ جمعۃ المبارک 18 تا 24 اپریل 2014ء

مسلک اہلحدیث کا داعی و ترجمان

ہفت روزہ الاعتصام

یکے از مطبوعات دار الدعوۃ السلفیۃ

شمارہ 16 جلد 66

بدل اشتراک

فی پرچہ	:	-/12 روپے
سالانہ	:	-/500 روپے
بیرونی ممالک سے	:	-/200 ریال -/60 ڈالر امریکی

خط کتابت کے لیے	:	ہفت روزہ الاعتصام، 31 شیش محل روڈ، لاہور
کرنٹ اکاؤنٹ نمبر	:	ABL 2466-4 بلال گنج برانچ، لاہور
فون نمبر	:	042-3735 4406
فیکس نمبر	:	042-37229802
رجسٹرڈ نمبر	:	CPL : 12

E-Mail: al.aitisam@gmail.com

پرنٹر: پرنٹ یارڈ پرنٹرز، لاہور۔ ناشر: حافظ احمد شاکر، مقام اشاعت: 31 شیش محل روڈ لاہور 54000

اداریہ

ہوشیار باش

محمد سلیم چنیوٹی

پاکستان کے دو پڑوسی ممالک (بھارت اور افغانستان) ان دنوں الیکشن سے گزر رہے ہیں۔ افغانستان میں امریکی اجارہ داری ۲۰۱۴ء سے ختم ہو رہی یا اس کے ختم کیے جانے کا جھانسہ دیا جا رہا ہے۔ افغان صدر حامد کرزئی سے وزیر اعظم میاں نواز شریف نے تبادلہ خیال کرتے ہوئے کہا کہ ہم ان پر امن انتخابات پر دل کی گہرائیوں سے آپ کو خراج تحسین پیش کرتے ہیں اور اُمید کرتے ہیں کہ نئی افغان قیادت یقیناً پاکستان کے ساتھ برادرانہ تعلقات کو حسب سابق فروغ دے گی۔ دہشت گردی کے نام سے جاری نام نہاد صلیبی جنگ کے نام پر امریکہ نے اب تک افغانستان میں ڈیرے ڈالے ہوئے ہیں۔ اس طویل اور بے مقصد جنگ میں امریکی ذلت آمیز شکست سے دوچار ہو کر ''شام کو لوٹ کے بدھو گھر کو آئے'' کے مصداق، ۲۰۱۴ء سے یہ اپنا لنگر اُٹھالے جانے کا پرچار کر رہے ہیں۔

شکست روس کے بعد جب افغانستان روسی ریچھ کے نحوستی قدموں کے نشانات سے پاک ہو گیا تو وہاں طالبان نے اسلامی حکومت کا پھریرا لہرا دیا، شرعی احکام کا نفاذ کیا، منشیات ختم کر کے افغانستان کو اسلحہ سے پاک کر دیا اور بڑی کامیابیوں سے افغانستان ترقی کی راہوں پر گامزن ہونے لگا۔

برادر اسلامی ملک افغانستان کی یہ کامیابیاں امریکی حکومت کے کارپردازوں کی آنکھوں میں تیر کی طرح کھٹکنے لگیں اور خریطۂ عالم پر امریکی حکمرانی کا خواب جب جھلملانے لگا تو اُنھوں نے نائن الیون کے نام سے ایک مکروہ سازش سے صلیبی جنگ چھیڑ دی اور افغانستان کی دھرتی میں آن وارد ہوئے۔

جب افغانستان میں طالبان حکومت اور وہاں کے عوام اللہ کی توفیق سے کچھ سنبھلنا شروع ہو گئے تو طاغوت وہاں بعض ایسے گروپس ابھارنے میں کامیاب ہو گیا جو آپس ہی میں گتھم گتھا ہونا شروع ہو گئے اور طاغوت نے اپنی روائتی دسیسہ کاریوں سے انھیں ایک دوسرے کے خون تک کا پیاسا کر دیا۔ سوشلزم اور صلیبی استبدادی قدموں کے نشانات جن افغان عوام نے بے مثال جرأت و دلیری سے اپنی دھرتی سے صاف کیے تھے انھیں مفادات کا الگ الگ فیڈر دے کر اپنی دھرتی کو برباد کرنے میں الجھا دیا گیا۔ ہم اُمید کرتے ہیں کہ افغان عوام ضرور یہ ضرور دشمن کے جانے کے بعد اپنی دھرتی کو خیر وسلامتی کا گہوارہ بنانے کا سوچیں گے۔ ان شاءاللہ

اسی طرح بھارت ہے جو پاکستان کا ایسا پڑوسی ہے کہ اس کے دل میں پاکستان کی فلاح و بہبود کے بارے میں اچھا خیال شاید ہی کبھی آیا ہو۔ بھارت اور پاکستان میں ممکن ہے کچھ لوگ یا رہنما ایسے ہوں جو دونوں ملکوں کے درمیان امن وآشتی اور دوستی چاہتے ہوں لیکن یہ تب ہی ممکن ہے جب بھارتی جنتا پارٹی پاکستان کو دل و جان سے تسلیم کرے مگر اس پارٹی لیڈروں کی اکثریت ایسی سوچ سے عاری ہے۔ بھارت میں پاکستان دشمنی کے منفی جذبات رکھنے والے لیڈروں اور جماعتوں کی کمی نہیں۔ ایسی ہی جماعتوں میں بی جے پی اور اس کے لیڈر نریندر مودی جیسے متعصب ہندو ہیں۔ یہ نریندر وہی ہے جسے بھارتی شہر گجرات میں مسلمانوں کی ایک ٹرین کو نذر آتش کروا دینے کا ذمہ دار ٹھہرایا گیا تھا۔ اب یہی جماعت بھارت میں سب سے زیادہ سرگرم اور بغض مسلم کے جذبات کو ہوا دے رہی ہے اِدھر پاکستانی سرکار کے بعض حکومتی ذمہ داران کے بعض ایسے بیانات بھی نظروں سے گزرے ہیں کہ اب بھارت کو پسندیدہ ملک قرار دینے کا وقت آن پہنچا ہے، جب کے حقائق اس کو تسلیم نہیں کرتے کیوں کہ پاکستان کے دریاؤں کا پانی خشک تو کجا نہریں تک ویرانی کا منظر پیش کر رہی ہیں، جب کہ بی جے پی مشہور پاکستان دشمن پارٹی کے طور پر معروف ہے اور اسے وہاں کے عوام اپنے قیمتی ووٹوں سے جتوانا بھی چاہ رہے ہیں۔ بھارتی وزیر اعظم من موہن سنگھ نے اپنے ایک بیان میں کہا ہے کہ بعض بھارتی لیڈر پاکستان کے خلاف اپنے بیانات داغ رہے ہیں انھیں یہ بیانات نہیں دینے چاہئیں کیوں کہ بھارت کے لیے معاشی

مسائل بڑھنے کے امکانات ہیں جو دونوں ملکوں میں جاری مفاہمانہ عمل کے لیے نقصان دہ ہوں گے۔

مذاکراتی عمل:

حکومت اور طالبان کے مابین جاری امن عمل کی بحالی کے لیے مذاکرات کی کوششیں جاری ہیں۔اللہ کرے یہ مذاکرات پائیدار امن کے لیے مفید ثابت ہوں۔

لیکن ان مذاکرات کے دوران پاکستان میں بعض دہشت گردانہ کارروائیاں مثلاً سبی ریلوے اسٹیشن پر ٹرین میں بم حملہ، پھر اسلام آباد سبزی منڈی میں ریموٹ بم حملہ، ان دونوں کارروائیوں میں کئی بے گناہ قیمتی جانیں ضائع ہوگئیں اور کئی ایک زخمی ہوگئے۔

اسی طرح کے کئی بحرانوں سے پاکستان ان دنوں گزر رہا ہے۔اس موقع پر پاکستان کے تمام مقتدر اداروں حکومت، فوج، عدلیہ اور پارلیمنٹ کو حوصلے اور صبر کا دامن تھام کر اپنے قدم پھونک پھونک کر اُٹھانے کی اشد ضرورت ہے۔ خطے کی صورت حال، افغانستان و ہندوستان میں قیادت کی تبدیلی اور نئی آنے والی قیادتوں کے پیش نظر ایک خوشحال اور مضبوط پاکستان ہی پائیدار امن واستحکام کا گہوارہ ہوسکتا ہے۔ پاکستان کی تمام سیاسی اور مذہبی جماعتیں جب تک پاکستان کی فلاح و بہبود کے ایک نکتے پر جمع نہیں ہوتیں اس وقت تک خدشات واندیشے جنم لیتے رہنے کی توقع بھی رکھنی چاہیے۔

طالبان اور حکومتی نمائندوں نے حالیہ دہشت گردانہ کارروائیوں کی اپنے اپنے بیانات کے ذریعے جس طرح تردید کی ہے یہ ایک حوصلہ افزا امر ہے کہ سب کو مل کر وطن اور اسلام دشمن قوت کا پتا لگانا چاہیے کہ ان مکروہ ہتھکنڈوں کے پیچھے کون سی دشمن قوت سرگرم ہے جو عوامی مقامات پر حملے کروا کر ایک سنسنی خیز فضا پیدا کر کے اپنے مفادات حاصل کرنے کی مذموم کوشش کر رہی ہے؟

جہد مسلسل:

پاکستان میں توانائی کا بحران ایک طویل عرصے سے جاری ہے۔مشرف اور زرداری حکومت میں تو اس کی طویل لوڈ شیڈنگ نے عوامی اور کاروباری حلقوں کو شدید پریشانی میں مبتلا کیے رکھا۔میاں نواز شریف حکومت نے اس توانائی بحران کو ایک چیلنج سمجھ کر حل کرنے کی ٹھان لی اس وقت صورتِ حال یہ ہے کہ اُنھوں نے کئی ایک عملی اقدامات اُٹھا کر توانائی بحران حل کرنے کی کوششیں بھی کیں اور مزید کر رہے ہیں۔اب گرمی کا موسم آنے سے قبل ہی دوبارہ اس مسئلے نے سر اُٹھالیا ہے اور لوڈ شیڈنگ کا دورانیہ پھر بڑھنے لگا ہے۔اس پر ایک ظلم یہ بھی کیا جانے لگا ہے کہ بجلی کے نرخ حسب ''معمول'' بڑھا کر آئی ایم ایف کو خوش کرنے کی سعی ناگوار جاری ہے۔

میاں برادران دن رات ملکی مسائل حل کرنے کی طرف بظاہر دل و جان سے جتے ہوئے ہیں۔ان کے تعمیری منصوبوں سے انکار بھی نہیں۔مگر جس طرح ترقیاتی منصوبوں کو تکمیلی مراحل سے گزارنے سے سابقہ حکمرانوں نے اپنی آنکھیں بند رکھیں اور بعض شہروں اور علاقوں میں معدنیات اور زمین سے مدفن خزانوں کو نکالنے سے اغماض برتتے رہے۔اُمید ہے کہ موجودہ حکومت اور حکمران اللہ کریم کے عطا کردہ ان خزانوں کو استعمال میں لا کر ملکی معیشت میں حائل رکاوٹوں پر جلد قابو پانے کی طرف خاص توجہ کریں گے۔حال ہی میں ہمارے سائنس دانوں نے چنیوٹ کے قریب ''رجوعہ سادات'' میں لوہے کے وسیع وعریض ذخائر کا پتا چلایا ہے بلکہ یہ ذخائر تو ایک طویل عرصے سے موجود ہونے کی خبریں گردش کر رہی تھیں لیکن سابقہ حکمرانوں نے اپنے سیاسی اللّوں تللّوں اور اپنے حریفوں کو نیچا دکھانے میں وقت صرف کر دیا۔اللہ تعالیٰ کی نصرت شامل حال رہی تو ملکی ترقی اور معیشت کی بحالی کے لیے اور روزگار کے نئے مواقع پیدا کرنے کے لیے اللہ کریم کے زیر زمین عطا کردہ ان مدفون خزانوں کو جلد نکالنے کی کوششیں یقیناً بارآور ہوں گی۔انسانوں کی مخلصانہ جہد مسلسل ہی سے یہ اُمور سرانجام دیے جاسکیں گے۔

درس قرآن (قسط نمبر ۴۹)

تفسیر سورة الصّٰفّٰت

مولانا ارشاد الحق اثری حفظہ اللہ

﴿اِنِّیْ سَقِیْمٌ﴾ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا: میں بیمار ہوں۔

''سقیم'' جسمانی بیماری کو کہتے ہیں۔ جب کہ لفظ ''مرض'' جسمانی اور قلبی دونوں بیماریوں کے متعلق استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ﴾[البقرة:۱۰]

''ان کے دلوں ہی میں ایک بیماری ہے۔'' (مفردات)

البتہ مجازی طور پر قلب سقیم، کلام سقیم، فہم سقیم بھی کہا گیا ہے۔ (تاج العروس)

حضرت یونس علیہ السلام کو جب مچھلی کے پیٹ سے اللہ تعالیٰ نے نکالا تب ان کے بارے میں فرمایا:

﴿فَنَبَذْنٰهُ بِالْعَرَاءِ وَهُوَ سَقِیْمٌ﴾[الصّٰفّٰت:۱۴۵]

''پھر ہم نے اسے چٹیل میدان میں پھینک دیا اس حال میں کہ وہ بیمار تھا۔''

ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں وہ پرندے کے بچے کی طرح جس پر کوئی بال نہیں ہوتے، ہوگئے تھے۔ یوں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بھی اپنے آپ کو سقیم کہا کہ میں بیمار ہوں تمھارے ساتھ جا کر موج میلے میں شریک نہیں ہوسکتا۔

کیا حضرت ابراہیم علیہ السلام فی الواقع بیمار تھے؟ اگر وہ فی الواقع بیمار تھے تو قوم کے چلے جانے کے معاً بعد اُنھوں نے بتوں کو پاش پاش کیسے کر دیا؟ اس بارے میں مختلف آراء ہیں:

① ...... آپ فی الواقع بیمار تھے۔ بعض نے تو سقیم سے طعین یعنی طاعون کی بیماری مراد لی ہے۔ مگر ان آثار کی کوئی سند قابل اعتبار نہیں۔

② ...... دوسرا قول جو اکثر مفسرین نے اختیار کیا ہے وہ یہ کہ اُنھوں نے فرمایا تو تھا کہ ''انی سقیم'' میں بیمار ہوں، مگر اس سے مستقبل میں بیمار ہونا مراد لیا تھا۔ یعنی "انی سأسقم" ان کی مراد تھی۔ حافظ ابن حجر نے کہا ہے اسم فاعل اکثر مستقبل کے معنی میں مستعمل ہوتا ہے۔ (فتح الباری:۶/۳۹۱) جیسے ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿اِنَّكَ مَیِّتٌ وَّاِنَّهُمْ مَّیِّتُوْنَ﴾[الزمر:۳۰]

''بے شک تو مرنے والا ہے اور بے شک وہ بھی مرنے والے ہیں۔''

یہاں بھی ''میت'' سے مراد ''ستموت'' ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم عنقریب فوت ہونے والے ہیں۔ یہ قطعاً مراد نہیں کہ وہ اور آپ اب مرے ہوئے ہو۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بھی تعریض وتوریہ کے انداز میں "انی سقیم" فرمایا مگر ان کی مراد "انی سأسقم" تھی۔

توریہ کا مطلب یہ ہے کہ کلام میں ایسا اسلوب اختیار کیا جائے کہ مخاطب متکلم کے اصل مقصد کو سمجھنے کی بجائے اسے اپنے مطلب و مقصد کے مطابق سمجھ کر مطمئن ہو جائے حالانکہ وہ متکلم کا منشا و مطلوب نہیں ہوتا۔ ایسا کلام اپنے اصلی تناظر میں سچا ہوتا ہے مگر مخاطب کے فہم کے اعتبار سے اس پر کذب کا اطلاق ہوسکتا ہے۔ بلکہ حقیقت معلوم ہو جانے پر مخاطب اسے کذب کہتا ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے "انی سقیم" کہنے کا مطلب بھی یہ تھا کہ "انی سأسقم"، مگر وہ سمجھے کہ یہ بیمار ہیں۔ اس لیے وہ انھیں

چھوڑ کر چلے گئے۔حدیث میں حضرت ابراہیم علیہ السلام پر اسی اسلوب میں ''کذب'' کا اطلاق ہوا ہے۔ چنانچہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((لـم يـكذب ابراهيم الا ثلاثة كذبات، ثنتين منهـن في ذوات الله، قوله "انى سقيم" وقوله "بل فعله كبيرهم" و قوله لسارة "أختى".))

(صحيح بخارى: ٣٣٥٨، صحيح مسلم: ٦١٤٥)

امام بخاری رحمہ اللہ نے یہ روایت چھ مختلف مقامات پر ذکر کی ہے۔ شیخین کے علاوہ یہ روایت ترمذی، ابو داود، مسند احمد وغیرہ کتب احادیث میں مروی ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تین بار کے علاوہ کبھی خلافِ واقعہ بات نہیں کہی، ایک جب اُنھوں نے فرمایا: میں بیمار ہوں۔ دوسری بات تب جب ان سے پوچھا گیا کہ ان بتوں کو کس نے توڑا ہے تو اُنھوں نے فرمایا: یہ ان کے بڑے (بت) نے کیا ہے۔ اور تیسری بار جب اُنھوں نے اپنی زوجہ محترمہ سارہ کے متعلق فرمایا: یہ میری بہن ہے۔

بعض حضرات نے کہا ہے کہ سب سے پہلے اس پر امام فخر الدین محمد بن عمر بن حسین رازی نے دبے لفظوں میں اس کے انکار کی کوشش کی حالانکہ ان سے بہت عرصہ پہلے امام ابو منصور محمد بن محمد الماتریدی (م ۳۳۳ھ) نے اپنی تفسیر میں اس حدیث کی صحت سے انکار کیا ہے ان کے بعد بعض دیگر حضرات نے بھی اس حدیث کو قرآن مجید میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں لقب "صـديقاً نبيًا" کے منافی قرار دیتے ہوئے اس کی صحت سے انکار کیا ہے۔

حالانکہ ان سے پہلے کبار ائمہ اُمت کو یہ حدیث قرآن پاک کے خلاف محسوس ہوئی نہ ہی اسے اُنھوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عظمت وعصمت کے منافی گردانا۔ بدیہی سی بات ہے۔ ان تمام ائمہ کبار کے بارے میں یہ قطعاً تصور نہیں کیا جا سکتا کہ انھیں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عظمت کا احساس نہ تھا تو یہ احساس بہت بعد میں بعض حضرات کو ہوا۔ پھر یہ ایک حدیث ہی نہیں بلکہ حدیث شفاعت میں خود حضرت ابراہیم علیہ السلام کے حوالے سے ہے کہ جب اولاد آدم قیامت کے روز شفاعت کے لیے ان کی خدمت میں حاضر ہوگی اور اللہ ذوالجلال والاکرام کے دربار میں ان سے شفاعت کی تمنا کرے گی تو وہ فرمائیں گے:

"ان قد كذبت ثلاث كذبات."

(صحيح بخارى: ٣٣٦١، ٤٧١٢)

''مجھ سے تین باتیں خلاف واقعہ ہوئی تھیں۔''

یہ حدیث حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے علاوہ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے صحیح بخاری (رقم: ۷۴۴۰) اور صحیح مسلم میں منقول ہے۔ امام بخاری نے اسے بھی مختلف مقامات پر ذکر کیا ہے۔ اس باب میں دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے بھی روایات مروی ہیں جیسا کہ حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں (۴۳۲/۱۱ رقم ۶۵۶۵ کے تحت) ذکر کیا ہے۔ اس لیے کسی ایک راوی کی نہیں، بہت سے راویوں کی بات ہے کہ اس روایت کی تغلیط کرنے والے کس کس راوی کی تغلیط کریں گے؟ پھر یہی نہیں بلکہ ان راویوں کی بیان کی ہوئی دوسری روایات کی حقیقت کیا رہ جاتی ہے؟



درسِ حديث

اربعین اعتقادی

ترجمہ وفوائد
حافظ ریاض عاقب اثری

فرائد الفوائد في جمع الأربعين من أحاديث العقائد

باب: وجوب الإيمان بالقدر، وقول الله تعالى:
﴿إِنَّا كُلَّ شَيْءٍ خَلَقْنَاهُ بِقَدَرٍ﴾[القمر: ٤٩]
وقال عليه الصلاة والسلام: ((لا يؤمن عبد، حتى يؤمن بأربع: يشهد أن لا إله إلا الله وأني رسول الله، بعثني بالحق، ويؤمن بالموت، وبالبعث بعد الموت، ويؤمن بالقدر.))(جامع ترمذي:٢١٤٧، سنن ابن ماجه :٨١. وصححه الألباني)

عن طاوس، أنه قال: أدركت ناسامن أصحاب رسول الله ﷺ يقولون: كل شيء بقدر، قال: سمعت عبدالله بن عمر يقول: قال رسول الله ﷺ:((كل شيء بقدر حتى العجز و الكيس.))(صحيح مسلم: ٢٦٥٥)

تقدیر پرایمان لاناواجب ہے:

فرمان باری تعالیٰ ہے:
''بے شک ہم نے ہر چیز کو ایک (مقرر) اندازے کے ساتھ پیدا کیا ہے۔''

اوررسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:
''اس وقت تک بندہ مومن نہیں ہوسکتا جب تک وہ چار چیزوں پر ایمان نہ لے آئے: (۱) وہ گواہی دے کہ اللہ کے ساتھ کوئی معبود نہیں اور بے شک میں اللہ کا رسول ہوں، اس نے مجھے حق دے کر بھیجا ہے۔ (۲) وہ موت پر ایمان لائے۔(۳) وہ موت کے بعد دوبارہ اُٹھنے پر ایمان لائے۔(۴) وہ تقدیر پر ایمان لائے۔''

جناب طاوس سے مروی ہے، اُنھوں نے فرمایا:
میں نے کئی صحابہ رضی اللہ عنہم کو یہ کہتے ہوئے پایا ہے کہ ہر چیز مقدر کے مطابق ہے، اُنھوں نے فرمایا: میں نے سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''ہر چیز مقدر کے مطابق ہے، حتیٰ کہ عاجزی وعقل مندی بھی۔''

فوائد:

۱: آیت مبارکہ سے تقدیر الٰہی کا اثبات ہوتا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:
''اللہ تعالیٰ نے سب مخلوقات کی تقدیروں کو آسمانوں اور زمین کی تخلیق سے بھی پچاس ہزار سال پہلے لکھ دیا تھا اور اس وقت اللہ کا عرش پانی پر تھا۔'' (صحیح مسلم: ۲۶۵۳)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کو مخلوقات پیدا کرنے سے پہلے ہی سب کا علم تھا اور اس نے تمام کی تقدیر لکھ دی تھی اس سے فرقہ قدریہ کا خوب ردّ ہوتا ہے جو تقدیر کا انکاری ہے۔ اس فرقے کا ظہور عہد صحابہ رضی اللہ عنہم کے آخر میں ہوگیا تھا۔ جس کی تفصیل تفسیر ابن کثیر میں دیکھی جاسکتی ہے۔

حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم منکرین تقدیر سے مقاطعہ کرتے تھے۔ جیسا کہ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے بارے آتا ہے کہ شام میں ان کا ایک دوست تھا جو ان سے خط کتابت کرتا رہتا تھا۔ سیدنا عبداللہ بن عمر

رضی اللہ عنہما نے ایک مرتبہ اسے لکھا کہ مجھے یہ بات پہنچی ہے کہ تم نے تقدیر کے بارے میں باتیں کی ہیں۔لہٰذا میری طرف آئندہ کوئی خط نہ لکھنا کیوں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے:

''عنقریب میری اُمت میں کچھ لوگ ایسے ہوں گے جو تقدیر کی تکذیب کریں گے۔'' (سنن ابوداود:۴۶۱۳،سنن ترمذی:۲۱۵۲،سنن ابن ماجہ:۴۰۶۱،مسند احمد:۲/۹۰)

۲: تقدیر الٰہی پر ایمان لانا ضروری ہے۔جو تقدیر پر ایمان نہیں رکھتا وہ مومن نہیں ہے۔

۳: کوئی چیز بھی اللہ تعالیٰ کی تقدیر و علم کے بغیر وجود میں نہیں آئی حتیٰ کہ بعض لوگ عقل مند ذہین ہوتے ہیں اور بعض بے وقوف اور جاہل تو یہ بھی تقدیر کے مطابق ہی ہوتا ہے۔

۴: صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تقدیر پر ایمان رکھتے تھے۔



تحقیق وتدقیق

اللہ تعالیٰ پر جسم کا اطلاق

(امام ابن تیمیہ پر لگے ایک الزام کی حقیقت)

ترتیب واضافہ: مفتی عبیداللہ خان عفیف حفظہ اللہ -- ازافادات: حضرت مولانا محمد عطاء اللہ حنیف بھوجیانی رحمہ اللہ

کتاب وسنت میں منقول صفات عالیہ ذاتیہ ہوں یا غیر ذاتیہ، صفات اسمیہ ہوں یا فعلیہ یعنی استواء اور نزول وغیرہ کے متعلق سلف صالحین کا عقیدہ ہے کہ وہ بغیر کسی تاویل، تعطیل، تحریف، تشبیہ، تمثیل، تکییف اور تجسیم کے معلوم المعنی اور مجہول الکیفیۃ ہیں۔ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ (م ۷۲۸ھ) نہ صرف اسی عقیدہ صحیحہ سلفیہ کے قائل ہیں جس کا اظہار انھوں نے اپنی پیشتر کتب عقائد، مثلاً: عقیدہ حمویہ، عقیدہ واسطیہ، مجموع فتاوی (ج: ۴، ۵) اور شرح حدیث نزول وغیرہ میں کتاب وسنت کی نصوص صریحہ، دلائل قطعیہ اور براہین ساطعہ کے ساتھ کیا ہے۔

مگر ان کے اس واضح اور مدلل مسلک اور عقیدہ کے برعکس چودھویں صدی کے مشہور سیاح ابوعبداللہ محمد ابن بطوطہ (م ۱۳۶۹ء) کے درج ذیل اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ اللہ تعالیٰ کے جسم کے قائل ہیں۔ ابن بطوطہ لکھتے ہیں:

"كنت اذ ذاك بدمشق فحضرته يوم الجمعة وهو يعظ الناس على منبر الجامع ويذكرهم فكان من جملة كلامه ان قال: ان اللّٰه ينزل الى السماء الدنيا كنزولي هذا، و نزل درجة من درج المنبر."

(رحلة ابن بطوطه: ۱/ ۲۱۷)

"(ابن تیمیہ کے خلاف معرکہ آرائیوں کے دنوں میں) میں دمشق میں موجود تھا۔ جمعہ کے دن جامع مسجد دمشق میں گیا تو ابن تیمیہ منبر پر وعظ کر رہے تھے۔ دورانِ وعظ یہ کہنے لگے کہ اللہ تعالیٰ (رات کے آخری حصے میں) پہلے آسمان پر اترتا ہے، پھر منبر کی اوپر کی سیڑھی سے ایک سیڑھی نیچے اتر کر کہا کہ یوں اترتا ہے جیسے میں اترا ہوں۔"

یہ ہے وہ سنا سنایا افسانہ جسے بغیر تحقیق کے نقل کیا جاتا رہا ہے۔ لیکن واضح رہے یہ بیان متعدد وجوہ سے غلط اور خلاف واقعہ ہے:

۱: ابن بطوطہ ۹ رمضان ۷۲۶ھ جمعرات کے دن دمشق پہنچے ہیں جب کہ امام بن تیمیہ ۱۶ شعبان ۷۲۶ھ سوموار کے دن یعنی ابن بطوطہ کے (دمشق) پہنچنے سے ۲۳ دن قبل قلعہ دمشق میں محبوس ہو چکے تھے۔ (رحلة ابن بطوطه: ۱/ ۱۸۷، البداية والنهاية: ۱۴/ ۱۲۳)

اور خود اسی کے بقول اسی قید ہی میں ۷۲۸ھ میں آپ کا انتقال ہوا جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ ابن بطوطہ نے امام صاحب سے نہ کوئی بات سنی اور نہ اس کو امام صاحب کے ساتھ کسی جگہ جمع ہونے کا اتفاق ہوا۔

۲: ابن بطوطہ کے بیان سے مترشح ہوتا ہے کہ امام صاحب جامع مسجد کے منبر پر خطبہ جمعہ دے رہے تھے حالانکہ یہ درست نہیں۔ کیوں کہ ابن بطوطہ نے خود ہی لکھا ہے کہ جامع مسجد دمشق کے خطیب وامام قاضی القضاۃ جلال الدین قزوینی تھے۔

(رحلة ابن بطوطة: ۱/ ۲۱۰)

اور یہ معلوم ہے کہ محکمہ قضا سے حضرت امام کا جھگڑا چل رہا تھا۔ ایسے حالات میں کاہے کو امام صاحب کو جامع مسجد دمشق کا منبر پیش کیا

گیا ہوگا خصوصاً جب کہ قزوینی کا شمار بھی امام صاحب کے مخالفین میں ہوتا ہے۔(الدرر الکامنة: ۱/ ۱٤٥)

۳: ابن بطوطہ نے لکھا ہے امام صاحب کے اس فقرے پر ایک فقیہ کے اعتراض کرنے پر شور ہوگیا جو امام صاحب کی قید پر منتج ہوا لیکن اس سلسلے میں محکمہ قضا نے جو فرد جرم امام صاحب پر لگا کر ان کو جیل مقید کیا، ان میں نزول الٰہی کے مسئلے کا ذکر نہ ابن بطوطہ نے کیا ہے اور نہ کسی دوسری جگہ اس کا نشان ملتا ہے۔ وہ مسئلے دو تھے: مسئلہ طلاق اور مسئلہ زیارت قبر نبوی۔

(رحلة ابن بطوطة: ۱/ ۲۱۸)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ افسانہ طرازی اگر عمداً نہیں کی گئی تو سفرنامہ کے مرتبین کی چوک کو ضرور اس میں دخل ہے۔

۴: جتنی اہمیت ابن بطوطہ نے اس واقعہ کو دی ہے اگر واقعی وقوع میں آیا ہوتا تو دوسرے واقعات نگار اس کا ذکر ضرور کرتے حالانکہ کہیں اس کا نشان نہیں ہے حتیٰ کہ مخالفین تک خاموش ہیں۔

۵: اندازہ یہ ہے کہ امام صاحب کے مخالفین نے یہ شاخشانہ ان کے خلاف اُٹھایا ہوا تھا۔ ابن بطوطہ نے سنی سنائی بات ذکر کردی۔ اس کی تائید حافظ ابن حجر کے اس بیان سے ہوتی ہے کہ امام صاحب کے مشہور مخالف بلکہ دشمن نصر منبجی (صوفی) اور ان کے ساتھیوں نے:

"ضبطوا عليه كلمات فى العقائد مغيرة ووقعت فى مواعظه وفتاويه فذكروا انه ذكر حديث النزول فنزل عن المنبر درجتين فقال كنزولي هذا فنسب الى التجسيم ."

(الدرر الكامنة:۱/ ۱٥٤)

''چند عقائد اپنی طرف سے ادل بدل کر کے امام صاحب کے ذمے لگا دیے۔ اور یہ مشہور کر دیا کہ اُنھوں نے منبر کی اوپر کی سیڑھی سے اتر کر'' کنزولی ہذا'' کہا اور یوں انھیں ''مجسمہ'' بنانے کی ناکام کوشش کی۔''

اور یہ واقعہ ان کے قیام مصر کے زمانہ کا ہے بس وہی بات کہیں سے ابن بطوطہ نے سن پائی اور دمشق کی بناڈالی۔

۶: ابن بطوطہ سے ایسا سہو (اگر عمداً نہیں کیا گیا) ہرگز مستبعد نہیں اس لیے کہ وہ واقعہ بتاتا ہے ۷۲۶ھ کا اور لکھوا رہا ہے ۷۵۷ھ میں تقریباً اُنتیس برس بعد بہت سے ممالک کی سیر و سیاحت سے فارغ ہوکر۔ پھر وہ بھی صرف حافظے سے کیوں کہ تحریری یادداشتیں تو وہ مدتوں پہلے ضائع کر چکا ہے (کہ معبر سے لوٹتے وقت سینور اور فاکنور کے درمیان لٹیروں نے تحریری یادداشتوں سمیت اس کا سارا اسباب لوٹ لیا تھا) ان حالات میں معلوم نہیں اسے کیوں کر درست باور کیا جا سکتا ہے۔

۷: ابن بطوطہ عقائد میں امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ سے دوسری سمت پر ہے جیسا کہ سفرنامہ میں بیان کردہ بعض واقعات سے پتا چلتا ہے اور زیر بحث افسانہ کے انداز بیان سے بھی ظاہر ہوتا ہے۔

علامہ تاج سبکی (م ۷۷۱ھ) لکھتے ہیں:

"لا ينبغي ان يقبل قول مخالف فى العقيدة على الاطلاق الاان يكون ثقة وقدروى شيئًا مضبوطا عاينه اوحققه ."

(طبقات الشافعية الكبرى : ۱/ ۱۹۸)

''عقیدے میں مخالف شخص کی بات اس کے مخالف کے بارے میں نہیں قبول کرنی چاہیے اِلا یہ کہ وہ قابل اعتماد ہو اپنا دیکھا یا تحقیق کردہ واقعہ بیان کرے۔''

۸: محقق مورّخوں کے نزدیک ابن بطوطہ اپنے بیانوں میں محتاط نہیں سمجھے گئے بلکہ ان کو غلط گو کہا گیا ہے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے مغرب کے ایک بڑے عالم علامہ ابوالبرکات محمد بن ابراہیم ابن بلقینی (م ۷۷۱ھ) کے حوالے سے ابن بطوطہ کے متعلق لکھا ہے:

"رماه بالكذب." (الدرر الكامنة: ٣/ ٤٨١)

''اُنھوں نے ابن بطوطہ کو غلط گو کہا ہے۔''

گویا شیخ سعدی کے اس مقولہ ''جہاں دیدہ بسیار گوید دروغ'' کی تصدیق ہوگئی۔

خلاصہ یہ کہ سفر نامہ ابن بطوطہ اور اس کے مصنف دونوں کی استنادی حیثیت کوئی ایسی قابل اعتماد نہیں۔ لہٰذا ایسے میں ان کا یہ بیان نہ درست ہے اور نہ قابل اعتماد، یہ محض سنا سنایا افسانہ ہے اور بس!

اور یہ اوپر معلوم ہو چکا کہ ابن بطوطہ قابل اعتماد بھی نہیں۔ نہ اس نے دیکھا نہ ہی تحقیق کی۔

۹: حضرت امام رحمہ اللہ کی اپنی تصریحات سراسر اس کے خلاف ہیں۔ نزول باری تعالیٰ کے مسئلے پر اُنھوں نے متعدد جگہ بحث کی ہے بلکہ مستقل کتاب (شرح حدیث نزول) تصنیف فرمائی ہے۔ دوسرے مقامات کے علاوہ اس کتاب میں اُنھوں نے صراحت کے ساتھ لکھا ہے کہ نزول باری تعالیٰ بلا کیف ہے اور وہ ہرگز ہرگز انسانوں کے نزول جیسا نہیں۔ ''انسانوں جیسے نزول'' کو وہ گمراہی اور بدعت تصور کرتے ہیں۔ کتاب مذکور میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

"ونزوله واستواء ه ليس كنزولنا واستواء نا."

(شرح حديث النزول، ص:١٥ طبع امرتسر)

''اللہ تعالیٰ کا نزول اور استواء ہم انسانوں جیسا ہرگز نہیں۔''

دوسرے مقام پر ارقام فرماتے ہیں:

"والذى يجب القطع به ان الله ليس كمثله شيئًا فى جميع مايصف به نفسه، فمن وصفه بمثل صفات المخلوقين فى شىء من الاشياء فهو مخطئ قطعا كمن ظن انه ينزل فيتحول وينتقل كما ينزل الانسان من السطح الى اسفل الدار فهذا باطل يجب تنزيه الرب عنه وهذا هوالذى تقوم على نفيه وتنزيه الرب عنه الادلة الشرعية والعقيلة." (شرح حديث النزول، ص:١١٢)

''یہ قطعی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی کسی بھی صفت میں کسی شے کی مثل نہیں۔ جو کوئی اللہ تعالیٰ کو اس کی کسی مخلوق سے کسی صفت میں مماثل ثابت کرتا ہے وہ یقیناً غلط کار ہے، مثلاً اگر کوئی یہ کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ انسانوں کی طرح نزول کرتا ہے اور اوپر سے نیچے کو آتا ہے تو اس کی بات سراسر باطل ہے۔ اللہ تعالیٰ اس سے منزہ اور پاک ہے۔ ادلہ شرعیہ وعقلیہ کا مقتضیٰ یہی ہے۔''

اس کتاب میں ایک مقام پر یہ صراحت ہے:

"الماثور عن سلف الامة وائمتها انه لايزال فوق العرش ولا يخلومنه العرش مع دنوه ونزوله الى السماء الدنيا ولايكون العرش فوقه وليس نزوله كنزول اجسام بنى آدم من السطح الى الارض."

(شرح حديث النزول، ص:٣٦)

''سلف امت اور اس کے ائمہ کرام سے یہ مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیشہ سے عرش پر مستوی ہے۔ آسمانِ دنیا کے قرب اور نزول کے باوجود عرش اس سے خالی نہیں ہوتا کہ عرش اس سے اوپر ہو جائے۔ حاصل یہ کہ اللہ تعالیٰ کا نزول ایسا نہیں جیسے اجسام بنی آدم چھت سے زمین کی طرف نیچے اُترتے ہیں۔''

(ازافادات حضرت مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی رحمہ اللہ، بہ حوالہ حیات شیخ الاسلام ابن تیمیہ، ص:۷۸۹-۷۹۵)



فکر ونظر

مردوزن کی مساوات فطرت کے منافی ہے!

عطاء محمد جنجوعہ

اہل مغرب آزادی کے علَم بردار بن کر دنیا بھر میں نام نہاد نسوانی حقوق کا پرچار کر رہے ہیں۔حقائق کے آئینے میں غور فرمائیے کہ فی الواقع وہ عورتوں کے حقوق کے محافظ ہیں یا لٹیرے!

اسلام سے قبل عورت مظلومی کی زندگی بسر کر رہی تھی اُسے کسی قسم کا کوئی حق حاصل نہ تھا۔وہ مردوں کے رحم وکرم پر تھی اُس کی بازاروں میں جانوروں کی طرح خرید وفروخت ہوتی تھی۔ایک مرد کی ملکیت میں کئی عورتیں ہوئی تھیں جس کے مرنے کے بعد وارث اُس کی بیویوں کو آپس میں تقسیم کرتے تھے،اسلام نے ہر صورت میں عورت کو میراث میں حق دار بنایا۔اسلام نے عورت کو عزت واحترام دے کر گھر کی مالکہ بنا دیا۔اسلام نے ماں کی عظمت ،بہن سے شفقت اور بیوی کے حقوق کا درس دیا۔محسن انسانیت ﷺ نے بیٹیوں کی عمدہ پرورش وتربیت کرنے والے کو جنت کا حق دار ٹھہرایا، ماں سے حسن سلوک کو قرب الٰہی کا ذریعہ کہا اور جنت کو ماں کے قدموں تلے فرمایا۔رحمت عالم ﷺ نے بیوی سے حسن سلوک کرنے والے شوہر کو اعزاز بخشا:

''کامل ایمان والے مومن وہ ہیں جو اپنے اخلاق میں سے اچھے ہوں۔اور تم میں سے اچھے وہ لوگ ہیں جو اپنی بیویوں کے حق میں سب سے اچھے ہوں۔'' (سنن ترمذی)

اسلام دین فطرت ہے جس کے اصول وضوابط معاشرے کی فلاح وبہبود اور خیر خواہی کی ضمانت فراہم کرتے ہیں۔مغربی معاشرے میں اولاد سن بلاغت کو پہنچ جائے تو اُس وقت والدین اُن کی پرورش و نگہداشت کی ذمہ داری سے سبکدوش ہوجاتے ہیں۔اب وہ خود کمائے اور کھائے اور اپنا جیون ساتھی تلاش کرے اُن پر کوئی قدغن نہیں۔مغربی عورت جذبات کی رو میں غلط فیصلہ کرتی ہے عموماً طلاق تک نوبت پہنچ جاتی ہے۔ہندو معاشرے میں لڑکی مجبور و بے بس ہوتی ہے اُس کے نکاح کے لیے والد کی اجازت ضروری ہے۔لڑکی کی رضا مندی ضروری نہیں۔اسلام اعتدال پسند مذہب ہے جہاں بچی کی دلچسپی ورضا مندی ضروری ہوتی ہے۔والد کے تجربہ اور بیٹی کی دلچسپی کے امتزاج سے فیصلہ معقول ہوتا ہے۔شادی شدہ جوڑا خوش مزاجی سے زندگی بسر کرتا ہے اور طلاق تک نوبت کم ہی آتی ہے۔یقیناً دین اسلام حکمت کا خزینہ ہے!

مرد وعورت بحیثیت تخلیق انسانی برابر ہیں۔وہ زہد وتقویٰ کی مسابقت میں بلند ترین مقام حاصل کر سکتے ہیں۔وہ دونوں اپنے افعال وکردار کے معاملہ میں اللہ کے سامنے جواب دہ ہیں۔البتہ طبعی ساخت کے لحاظ سے عورت اور مرد مختلف ہیں۔دونوں کے فطری اوصاف اور دائرہ کار جدا ہیں۔اس بنا پر اُن کے حقوق وفرائض مختلف ہیں۔

مرد فطری طور پر جفاکش قوی اور توانا ہوتا ہے۔اللہ تعالیٰ نے بھاری بھرکم ذمہ داریاں مرد پر عائد کی ہیں۔وہ معیشت ، زراعت و تجارت ،صنعت وحرفت اور دفاعی امور کا ذمہ دار ہے۔جب کہ عورت نرم ونازک ہوتی ہے اُس کو محبت ،شفقت ،الفت اور ماتا کے اوصاف سے نوازا ہے۔اس بنا پر نسل نو کی تخلیق اور پرورش وتربیت کی ذمہ داری عورت پر عائد کی ہے۔اسلام میں عورت اپنے خاوند کے گھر کی نگران و ملکہ ہے۔امتیازی فرق کے باوجود نسل انسانی کی ترقی وفلاح و بہبود کے لیے مرد وعورت کا کردار لازم وملزوم ہے۔تاہم نوعیت مختلف ہے۔

عورت کو ایام ماہواری، حمل اور رضاعت کے دشوار مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ اگر اُسے مذکورہ مدت میں معاشی ضروریات پورا کرنے کے لیے گھر سے باہر جانا پڑے تو اُسے آزادی نصیب ہوئی یا تکلیف......!!!

اسلام نے اہل وعیال کی کفالت کی ذمہ داری مرد پر عائد کی ہے، عورت پر نہیں۔ مرد اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر محنت ومشقت کرتا ہے۔ پگھلتے لوہے کو سانچے میں ڈھالنا، پہاڑ کھود کر معدنیات نکالنا، سمندر کی عمیق گہرائی تک جا کر ہیرے جواہرات تلاش کرنا۔ فلک بوس پلازوں کی تعمیر وزیبائش کرنا، دشمن کے سامنے سینہ سپر ہونا وغیرہ۔ غور کیجیے، کیا یہ اُمور صنف نازک بہ آسانی سرانجام دے سکتی ہے؟ ہرگز نہیں یہ صنف نازک کے بس کا روگ نہیں۔ اللہ نے جفاکشی وجرأت کے اوصاف مرد میں ودیعت کیے ہیں اور وہ ہی احسن طریق سے انھیں سرانجام دے سکتا ہے۔

اگر میاں بیوی دونوں روزگار کے سلسلے میں گھر سے باہر جائیں تو بچوں کی نگہداشت کون کرے گا؟ اگر آیا کا انتظام بھی کرلیا جائے تو بچوں کی پرورش اور اخلاقی تربیت جو حقیقی ماں کرسکتی ہے وہ آیا نہیں کرسکتی کیوں کہ اپنے بچے کے بارے میں جیسے جذبات ایک ماں کے ہوسکتے ہیں وہ اور کسی کے نہیں ہوسکتے۔

اسلامی معاشرے میں عورت گھر کی مالکہ بن کر خانگی فرائض سرانجام دیتی ہے مرد شرعی طور پر بیوی بچوں کی کفالت کا ذمہ دار ہوتا ہے۔

اسلام اللہ کا نازل کردہ نظام ہے جس کے ضابطے مرد وعورت کی فطرت کے عین مطابق ہیں۔ اور اس نظام میں ذمہ داریوں کے اعتبار سے مرد وزن میں تفاوت رکھا گیا ہے۔



خطبہ صدارت

جامعہ تعلیم الاسلام ماموں کانجن کی ۳۹ ویں سالانہ کانفرنس پر پڑھا گیا

محمد اسحاق بھٹی

حضرت صوفی محمد عبداللہ رحمہ اللہ کے قائم کردہ جامعہ تعلیم الاسلام ماموں کانجن میں انتالیسویں سالانہ کانفرنس کا انعقاد ہوا۔ یہ کانفرنس اپنی سابقہ روایات کے مطابق بڑی شان دار اور روحانی وعلمی ماحول میں جاری رہی۔ اس کا آغاز ۱۱/اپریل ۲۰۱۴ء کو خطبہ جمعۃ المبارک سے ہوا اور ۱۲/اپریل ہفتے کی رات گئے تک علمائے کرام کے خطابات جاری رہے۔

اس کانفرنس کی خاص بات تقریب بخاری شریف تھی۔ الحمد للہ حضرت صوفی صاحب کے لگائے ہوئے اس پودے (جامعہ تعلیم الاسلام) سے امسال فارغ التحصیل طلباء کی دستار بندی بھی کی گئی۔ صحیح بخاری کی آخری حدیث پر درس حضرت الاستاذ حافظ مسعود عالم حفظہ اللہ نے ارشاد فرمایا۔ فقاہت امام بخاری پر حضرت شیخ الحدیث مولانا عبدالعزیز علوی حفظہ اللہ نے گفتگو فرمائی۔

اس کانفرنس کی روایت کے مطابق خطبہ صدارت حضرت مولانا محمد اسحاق بھٹی حفظہ اللہ نے ارشاد فرمایا۔ جس کی تاریخی اہمیت اور معلومات کے پیش نظر ہم نذرِ قارئین کر رہے ہیں۔ (ادارہ)

الحمد لله رب العالمين والصلاة والسلام على خير خلقه محمد واله واصحابه وازواجه وذرياته اجمعين .

علمائے کرام وحضراتِ گرامی! اس مقام کو جہاں ہم اس وقت جمع ہیں روحانی، علمی اور تدریسی اعتبار سے بے حد اہمیت حاصل ہے۔ یہ ایک دارالعلوم ہے، جس کا نام جامعہ تعلیم الاسلام ہے۔ اس کی پہلی اینٹ ۱۳ستمبر ۱۹۶۳ء کو جمعۃ المبارک کے دن ٹھیک نو بج کر ۱۲منٹ پر حضرت صوفی عبداللہ رحمہ اللہ نے اپنے مبارک ہاتھوں سے رکھی تھی۔ اس کا پہلا تبلیغی جلسہ ۱۹۶۴ء میں اسی مقام پر ہوا تھا۔ اس جلسے کے انعقاد پر حضرت صوفی صاحب نے نہایت مسرت کا اظہار کیا تھا اور اسے تبلیغ دین کا مؤثر ذریعہ قرار دیا تھا۔

اس سے قبل جب صوفی صاحب اوڈاں والا میں قیام فرما تھے تو تبلیغی جلسے وہاں منعقد ہوتے تھے۔ وہاں پہلا جلسہ ۱۹۳۲ء میں ہوا تھا۔ بعدازاں مسلسل چودہ سالانہ جلسے ہوئے۔ ان جلسوں میں جو علمائے عظام شرکت فرماتے اور تقریریں کرتے تھے، وہ تھے مولانا ثناء اللہ امرتسری، مولانا محمد ابراہیم میر سیالکوٹی، مولانا سید محمد داود غزنوی، مولانا محمد اسماعیل سلفی، مولانا حافظ عبداللہ روپڑی، مولانا عبدالحق ہاشمی مہاجر مکی، مولانا عبدالمجید سوہدروی اور دیگر بہت سے حضرات۔ اس علاقے کے لوگ کثیر تعداد میں ان جلسوں میں حاضر ہوتے اور نہایت شوق سے علماء کی تقریریں سنتے تھے۔ پھر دارالعلوم اوڈاں والا سے ماموں کانجن منتقل ہوا تو جلسوں کے انعقاد کا سلسلہ یہاں شروع ہو گیا۔

جو حضرات اب تک ان جلسوں کی صدارت فرما چکے ہیں، ان میں بیت اللہ شریف کے امام محترم شیخ محمد بن عبداللہ السبیّل، مدینہ یونیورسٹی کے پروفیسر عبداللہ صالح العبید اور شیخ عبداللہ عبدالمحسن الترکی جیسی عالی قدر شخصیات شامل ہیں۔ اور پاکستان کے جن ذی مرتبت اصحاب علم کا ان جلسوں کی صدارت کے لیے انتخاب عمل میں آیا، ان کی طویل فہرست میں مولانا محمد حنیف ندوی، مولانا عبداللہ جھال خانوآنہ (فیصل آباد) اور متعدد دیگر حضرات کے اسمائے گرامی درج ہیں۔ آج

کے جلسے کی صدارت کے لیے اس بندہ عاجز کو منتخب کیا گیا ہے جو آپ کی خدمت میں حاضر ہے۔ مجھے اعتراف ہے کہ میں علم وعمل اور قابلیت کے اعتبار سے اس منصب کا اہل نہیں، لیکن جلسے کے اربابِ انتظام کا شکر گزار ہوں کہ اس عزت افزائی سے اس فقیر کو سابق اصحابِ کمال صدور کی صف میں شرکت کی سعادت سے بہرہ ور کیا، جزاہم اللہ۔

حضرات! آگے بڑھنے سے پہلے آیئے یہاں چند ساعتیں رک کر پرانی یادیں تازہ کرلیں اور عمل وکردار کے جو قافلے یہاں سے گزرے ہیں اور فرشتۂ اجل نے جن کو ہم سے جدا کردیا ہے، ان کے قدموں کے نشانات پر حزن وملال کے چند آنسو بہالیں ع

قفا نبك من ذكرى حبيب و منزل

گزشتہ جلسوں کی کارروائیوں کو ذرا چشم تصور میں لایئے۔ یہاں آپ کو قاضی محمد اسلم سیف سٹیج پر اپنے خاص انداز میں مقررین کا تعارف کراتے اور ان کی تقریروں کے متعلق اعلان کرتے ہوئے نظر آئیں گے۔ جلسے کے منتظم اعلیٰ مولانا عبدالقادر ندوی ہر مقرر کے ساتھ ہم کلام ہوتے اور مہمانوں کا کامل احترام سے استقبال کرتے دکھائی دیں گے۔ چک نمبر ۴۷۹ کے خلیل اثری اور حکیم ثناء اللہ اپنے رفقائے کار کی رفاقت میں حاضرین کی خدمت میں مصروف کار نظر آئیں گے۔ اسی طرح آپ بہت سے احباب کو مشغولِ عمل وحرکت پائیں گے۔ لیکن موت نے ان کو ہم سے چھین لیا اور اب وہ دور دور تک کہیں دکھائی نہیں دیتے اور نہ کبھی دکھائی دیں گے۔ ہم بھی رختِ سفر باندھے ہوئے اللہ کے پیغام کا انتظار کر رہے ہیں، انشاء اللہ خاں انشآء کی زبان میں کہنا چاہیے۔

کمر باندھے ہوئے چلنے کو یاں سب یار بیٹھے ہیں
بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں

حضرات! اس عظیم تدریسی ادارے کی، جہاں آپ تشریف فرما ہیں، پوری تاریخ جس شخصیت کے گرد گھومتی ہے، اس شخصیت کو صوفی عبداللہ کے نام نامی سے موسوم کیا جاتا ہے رحمہ اللہ۔ صوفی صاحب موصوف کا ۱۹۲۲ء کے لگ بھگ یعنی آج سے تقریباً ۹۱، ۹۲ برس پہلے چک نمبر ۴۹۳ اوڈاں والا میں ورود ہوا جو یہاں سے پانچ کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ یہ گاؤں ۱۹۰۵ء میں آباد ہوا تھا اور صوفی صاحب کی آمد کے وقت اس گاؤں کی عمر سترہ اٹھارہ برس کی تھی۔ صوفی صاحب نے یہاں کے لوگوں سے قریبی تعلقات پیدا کر کے ایک دینی مدرسہ جاری کیا، جس میں مختلف اوقات میں حافظ محمد اسحاق حسینوی، مولانا حافظ عبداللہ بڈھیمالوی، مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی، مولانا محمد عبدہ اور دیگر بہت سے اساتذہ نے فرائض تدریس سرانجام دیے۔ اس مدرسے کی تاریخ میں ایسی ساعتِ سعید بھی آئی کہ اس کی مسندِ تدریس پر عرب وعجم کے جلیل القدر محدث حضرت حافظ محمد گوندلوی رحمہ اللہ بھی رونق افروز ہوئے۔

اوڈاں والا کے اس مدرسے نے بڑی شہرت پائی اور بے شمار علماء وطلباء نے اس کے نامی گرامی اساتذہ کے حضور زانوئے شاگردی تہ کیے، جن میں مقامی حضرات میں سے مولانا عبدالقادر ندوی، مولانا عبدالصمد رؤوف اور مولانا محمد صادق خلیل کے اسمائے گرامی بالخصوص قابل ذکر ہیں اور غیر مقامی طلباء کی فہرست تو اتنی طویل ہے کہ ان کے صرف نام لکھنے کے لیے پوری کتاب درکار ہے۔ صرف چند حضرات کے نام ملاحظہ ہوں: ڈاکٹر پروفیسر محمد اسماعیل عقیل گورایہ، پروفیسر ظفر اللہ چودھری، مولانا پیر محمد یعقوب قریشی، مولانا محمد اسحاق چیمہ، مولانا محمد یعقوب ملہوی، قاضی محمد اسلم سیف، مولانا عبدالرشید ہزاروی، مولانا محمد علی حامد (موجودہ شیخ الحدیث جامعہ تعلیم الاسلام ماموں کانجن)، مولانا عبدالمجید ہزاروی، مولانا عبدالغفور جہلمی، پروفیسر غلام نبی عارف، مولانا محمد مدنی، حافظ فتح محمد فتحی (مکہ مکرمہ) اور ان کے علاوہ لاتعداد حضرات۔

اوڈاں والا میں صوفی صاحب کا جاری کردہ مدرسہ تعلیم الاسلام ۱۹۶۳ء تک وہاں رہا۔ وہ مستجاب الدعوات بزرگ تھے۔ اللہ نے ان

کو یہ شرف بخشا تھا کہ اِدھر اُنھوں نے اس کی بارگاہِ قدس میں ہاتھ اُٹھائے اور کوئی التجا پیش کی، اُدھر اس کی اجابت کے لیے بابِ خداوندی وا ہوا گیا۔ فارسی کے الفاظ کے مطابق یوں سمجھے کہ ؎

اجابت از درِ حق بہرِ استقبال می آید

ان کی دعا تھی کہ مدرسہ ریلوے سٹیشن کے قریب منتقل ہو جائے۔ چنانچہ حالات نے کروٹ لی، اللہ نے اپنے اس برگزیدہ بندے کی دعا کو قبولت سے نوازا اور مدرسہ ماموں کانجن کے ریلوے سٹیشن کے قریب آ گیا۔ لیکن کس طرح آیا؟ سنیے!

یہ رقبہ جہاں جامعہ تعلیم الاسلام قائم ہے اور جہاں آپ تشریف فرما ہیں، یہ سرکاری زرعی رقبہ تھا۔ اس کی نیلامی کا اعلان ہوا تو مولانا عبدالقادر ندوی نے اپنی گرہ سے رقم دے کر اسے نیلامی میں خرید لیا۔ بعد میں اسے صوفی صاحب کے نام کرا دیا اور پھر اسے جامعہ تعلیم الاسلام کے لیے وقف کر دیا گیا۔ یہ رقبہ کئی ایکڑ میں پھیلا ہوا ہے اور مولانا عبدالقادر ندوی کو اللہ نے توفیق بخشی کہ اُنھوں نے اسے خرید کر صوفی صاحب کے حوالے کر دیا۔

ہم دیکھ رہے ہیں کہ اس وسیع عمارت میں تدریس کا سلسلہ بھی جاری ہے طلباء کے لیے ہوسٹل بھی ہے، مہمانوں کے لیے مہمان خانہ بھی ہے اور اساتذہ کے لیے مکانات بھی تعمیر کیے گئے ہیں۔ خاصا بڑا ہال بھی ہے، ہزاروں کتابوں پر مشتمل لائبریری بھی ہے، بہت بڑی مسجد بھی ہے اور جامعہ کا اتنا بڑا گراؤنڈ ہے کہ جلسہ اسی میں کیا جاتا ہے جس میں ہزاروں لوگ آسانی سے بیٹھ کر مقررین کی تقریریں سن سکتے ہیں۔

اوڈاں والا میں بھی مدرسہ جاری ہے، صوفی صاحب نے اس کا نام مدرسہ تعلیم الاسلام رکھا تھا، لیکن اب اس کا نام دارالعلوم تقویۃ الاسلام ہے اور اس کے مہتمم مولانا محمد یعقوب ملہوی کے فرزند گرامی حافظ محمد امین صاحب ہیں۔ یہ دارالعلوم بھی کامیابی سے اپنا تدریسی سفر طے کر رہا ہے۔

اخوانِ کرام! یہاں یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ جامعہ تعلیم الاسلام کسی خاص فرد یا خاندان کی ملکیت نہیں ہے۔ یہ خالص قومی ادارہ ہے اور تمام مسلمانوں کی مشترکہ متاع ہے، جس میں آپ حضرات کے عطیات کی وجہ سے درس وتدریس کی صورت میں قرآن وحدیث کی خدمت انجام دی جارہی ہے۔ اب تک اس کے تین صدر یا مہتمم منتخب ہو چکے ہیں اور تینوں کا ایک دوسرے سے کوئی رشتہ، ناتہ یا خونی تعلق نہیں ہے۔ اس کے اوّلیں صدر یا مہتمم اس کے بانی صوفی عبداللہ مرحوم تھے۔ ان کی وفات کے بعد دوسرے مولانا عبدالقادر ندوی کو بنایا گیا۔ وہ اپنے علم وفضل اور خدمات کی بنا پر اس منصب کے صحیح حق دار تھے۔ وہ سفر آخرت پر روانہ ہوئے تو تیسرے شخص جنھیں اس مسند پر متمکن کیا گیا، حافظ مقصود احمد صاحب ہیں جو صلاحیت وصالحیت کے اعتبار سے بفضلِ الٰہی اپنا ایک مقام رکھتے ہیں اور اس وقت یہاں تشریف فرما ہیں۔ ہم عاجز بندوں کی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحومین کو جنت الفردوس میں داخل فرمائے اور حافظ صاحب کو صحت وعافیت اور خیر وصلاح کی لمبی زندگی عطا فرمائے آمین۔

یہ تینوں حضرات مختلف برادریوں اور خاندانوں سے تعلق رکھتے ہیں، ان کا باہمی اشتراک صرف اسلام کا اشتراک ہے اور یہی ان تینوں کے درمیان "کلمة سواء" ہے جو جامعہ کی خدمت کا باعث ہے۔ جہاں تک میں جانتا ہوں ان میں سے کسی نے اپنے خاندان کے کسی فرد کو جامعہ کی مجلس انتظامیہ کا رکن نہیں بنایا۔ نہ اپنے کسی عزیز کو اس کا مدرس مقرر کیا، نہ کسی اور ذمہ دارانہ منصب پر اس کا تقرر عمل میں لایا گیا۔ کسی کے ذاتی اور خاندانی معاملات کا (میرے علم کے مطابق) یہاں کوئی عمل دخل نہیں ہے۔ سارا معاملہ قابلیت اور صلاحیت کی بنا پر چل رہا ہے اور ان شاء اللہ چلتا رہے گا، اس لیے کہ اصل اہمیت اسی کو حاصل ہے۔

دوستو اور عزیزو! یہاں یہ بھی سنتے جائیے کہ مدرسے شروع کرنا آسان ہے لیکن انھیں جاری رکھنا بہت مشکل ہے۔ حضرت صوفی صاحب رحمہ اللہ کو بھی مدرسے کے اجرا کے بعد بہت سے مشکل مراحل

سے گزرنا پڑا۔انھوں نے اوڈاں والا میں مدرسہ شروع کیا تو کئی قسم کی رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑا۔کبھی ایسا موقع آیا کہ طالب علم اِدھر کا رخ کرنے پر تیار نہ ہوئے،کبھی اساتذہ نے وہاں جانا اور اس ماحول میں رہنا پسند نہ کیا،کبھی پیسے کا حصول رکاوٹ بنا۔غرض کئی انواع کی مجبوریاں سامنے آئیں،لیکن صوفی صاحب نے ہمت نہیں ہاری۔وہ پورے عزم کے ساتھ میدان میں اترے اور پھر تمام مشکلات کا حوصلہ مندی سے مقابلہ کیا۔چوں کہ ارادہ نیک تھا اور نیت صاف تھی،اس لیے کسی قسم کی مشکل انھیں شکست نہ دے سکی اور وہ بہ دستور قدم آگے بڑھاتے رہے۔

ہر تکلیف کے موقع پر انھوں نے اللہ پر بھروسا کیا اور جو مشکل سامنے آئی اس کو رفع کرنے لیے نہایت عاجزی کے ساتھ اس کے دربار میں ہاتھ پھیلا دیے۔پھر جو کچھ اس سے مانگا اس نے دیا۔انھوں نے اللہ سے فریاد کی کہ یہ کام میرا نہیں،تیرا ہے۔میرا اس میں کوئی ذاتی فائدہ نہیں،میں تیرے دین کی اشاعت کا متمنی ہوں اور چاہتا ہوں کہ لوگ تیرا دین سیکھیں اور پھر اس کی آگے تبلیغ کریں۔اگر میرا یہ نقطہ نظر صحیح ہے اور میں پورے اخلاص کے ساتھ یہ کام کرنے کا خواہاں ہوں تو تُو اس میں میری مدد فرما،چنانچہ اللہ تعالیٰ برابر ان کی مدد فرماتا رہا۔

مدرسہ اوڈاں والا سے ماموں کانجن منتقل کرنے کا وقت آیا تو اس وقت بھی بہت سی دقتیں پیش آئیں۔بڑا مسئلہ تعمیر کا تھا اور تعمیر کے لیے بہت بڑی رقم کی ضرورت تھی۔اس کے ساتھ ہی اساتذہ کی ماہانہ تنخواہوں اور طلباء کے اخراجات کا سلسلہ تھا،اللہ کی مہربانی سے سب کام کسی نہ کسی صورت میں ہوتے رہے اور تکمیل کو پہنچتے گئے۔اس سلسلے میں مولانا عبدالقادر ندوی کہا کرتے تھے اور بھی بے شمار لوگ کہتے ہیں کہ اس میں صوفی صاحب کی دعاؤں کا بڑا دخل ہے۔وہ دعا کرتے اور اللہ تعالیٰ قبول فرماتا۔میں نے صوفی صاحب کے حالات میں ایک کتاب لکھی ہے۔اس میں ان کی بہت سی دعاؤں کا تذکرہ کیا ہے۔یہاں صرف ایک دعا کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔

مولانا عبدالرشید ہزاروی کی روایت سے ایک واقعہ سنیے۔وہ بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ نظام آباد (ضلع گوجراں والا) کی مسجد اہل حدیث میں نمازِ جمعہ کے بعد مولانا احمد الدین گکھڑوی سے ملاقات ہوئی۔صوفی صاحب کے متعلق گفتگو کا سلسلہ شروع ہوا تو مولانا احمد الدین گکھڑوی نے فرمایا صوفی عبداللہ تو خدا سے چمٹ کر بات منوالیتا ہے،اس نے اللہ تعالیٰ سے اتنا تعلق پیدا کرلیا ہے کہ وہ جو کچھ اس سے مانگتا ہے وہ عنایت فرما دیتا ہے۔

مولانا عبدالرشید ہزاروی نے مولانا احمد الدین گکھڑوی سے اس کی تفصیل بتانے کو کہا تو انھوں نے فرمایا کہ صوفی صاحب ایک دفعہ اتنے بیمار ہوئے کہ چلنا پھرنا مشکل ہوگیا۔پورا ایک مہینا یہی حالت رہی۔ایک دن مدرسے کا خزانچی آیا اور اس نے کہا کہ مدرسین کی تنخواہوں کے لیے رقم نہیں ہے۔فرمایا:آپ قرضِ حسنہ کے طور پر کچھ روپے دے دیں۔لیکن اس نے انکار کردیا،کہا آپ بسترِ مرض پر پڑے ہیں،اگر آپ وفات پاگئے تو میں رقم کس سے لوں گا؟

خزانچی کا یہ جواب سن کر صوفی صاحب نے فرمایا:اچھا،جس کا کام ہے،اسی پر چھوڑ دو،وہ خود ہی انتظام کردے گا۔

یہ کہہ کر پانی منگوایا،وضو کرکے دو رکعت نماز پڑھی اور ہاتھ اٹھا کر اللہ کی حمد وثنا بیان کی۔پھر مسنون دعائیں پڑھیں۔بعدازاں خدا کے حضور عرض کیا:خدایا!میں ایک مہینے سے بیمار پڑا ہوں،تندرست ہوتا تو علماء وطلبا کے خرچ کے لیے کچھ انتظام کرتا۔اب تُو نے مجھے بیمار کردیا۔میرا کیا نقصان ہے۔تیرے سوا میرا ساتھی بھی کوئی نہیں۔خزانچی کا جواب تُو نے سن لیا۔اب تُو ہی انتظام فرما۔کافی دیر اسی طرح دعا کرتے رہے۔دعا ختم ہوئی تو کچھ دیر بعد بخار اتر گیا۔شام کو ضلع شیخوپورہ کے قصبہ نبی پور پیراں سے پیر سید عبداللہ شاہ مرحوم عیادت کے لیے آئے۔حالات دریافت کیے تو صوفی صاحب نے وہ بات سنائی جو خزانچی نے کہی تھی۔

پیر عبداللہ شاہ نے ماہانہ خرچ کا اندازہ پوچھا تو فوری طور پر جتنی رقم

کی ضرورت تھی، وہ بتائی۔شاہ صاحب نے کہا آپ کی تو صحت اچھی نہیں ہے، کسی بااعتماد آدمی کو میرے ساتھ بھیج دیجیے، میں رقم اسے دے دوں گا۔صوفی صاحب نے ان کے ساتھ کسی آدمی کو بھیج دیا، انھوں نے اس کے ہاتھ مطلوبہ رقم بھیج دی اور فوری طور پر اتنی ہی رقم کی ضرورت تھی۔

مولانا احمد الدین گکھڑوی نے یہ واقعہ بیان کر کے مولانا عبدالرشید سے کہا: دیکھا آپ نے اس صوفی نے خدا کو کس طرح منایا۔

مولانا عبدالرشید راشد ہزاروی کا ذکر اس کتاب میں جو میں نے صوفی صاحب کے متعلق لکھی ہے، متعدد مقامات پر آیا ہے۔وہ میرے مخلص دوستوں میں سے ہیں اور صوفی صاحب کے بہت قریب رہے ہیں۔وہ کہتے ہیں کہ انھوں نے مولانا احمد الدین گکھڑوی کا بیان کردہ یہ واقعہ صوفی صاحب کو سنایا تو انھوں نے اس کی تصدیق فرمائی یعنی صوفی صاحب نے پریشانی کی حالت میں دعا کی تھی اور پیر عبداللہ شاہ تشریف لائے تھے اور انھوں نے وہ رقم بھجوائی تھی، جس کی انھیں فوری ضرورت تھی۔یہ کوئی بہت قدیم دور کی باتیں نہیں ہیں۔چند سال پیشتر کے واقعات ہیں۔

صوفی صاحب کی قبولیت دعا کے ان واقعات کے گواہ اب بھی کثیر تعداد میں موجود ہیں۔اوڈاں والا کے لوگ، اس کے قرب وجوار کے باشندے، وہاں کے دارالعلوم کے پرانے اور موجودہ اساتذہ وطلباء، دارالعلوم کی انجمن کے ارکان، اس نواح کے زمیندار اور تجارت پیشہ لوگ، سب ان کی قبولیت دعا کے عینی شاہد ہیں اور بتاتے ہیں کہ لوگ دور دراز سے بھی آتے تھے اور قرب وجوار سے بھی حاضر ہوتے تھے۔صوفی صاحب سے اپنی تکلیفیں اور ضرورتیں بیان کرتے، دعا کراتے اور اللہ تعالیٰ دعا قبول فرماتا۔

صوفی صاحب کی نہ بیوی تھی، نہ بچے تھے، نہ بہن بھائیوں کا فکر تھا، ان کا مسئلہ صرف مدرسہ تھا اور طلباء تھے۔طلباء سے انھیں بے حد پیار تھا ان کی بات وہ توجہ سے سنتے اور ان کی ہر ضرورت پوری کرنے کی کوشش فرماتے۔طلباء کو وہ اپنے بیٹے قرار دیتے تھے۔ایک دن صوفی صاحب کے پاس ایک مہمان آئے۔باتیں کرتے ہوئے انھوں نے صوفی صاحب سے پوچھا: آپ کے کتنے بیٹے ہیں؟

فرمایا: تقریباً ایک سو! مہمان نے تعجب سے کہا: ایک سو؟ جواب دیا: ہاں! ایک سو کے قریب ہی ہوں گے۔مہمان نے کہا: میں آپ کی بات سمجھا نہیں۔فرمایا: ان طالب علموں کو جنھیں آپ دیکھ رہے ہیں، ماں باپ میرے پاس بھیج دیتے ہیں۔میں انھیں پڑھاتا ہوں، لکھاتا ہوں، ان کی تربیت کرتا ہوں، ان کی رہائش کا انتظام کرتا ہوں، ان کے لیے روٹی پانی کا اہتمام کرتا ہوں، انھیں پڑھنے کے لیے کتابیں دیتا ہوں۔یہ سب میرے بیٹے ہیں اور ان کی تعداد ایک سو کے قریب ہے۔

یہ طلباء سے صوفی صاحب کے پیار اور حسن سلوک کی انتہا تھی۔کبھی وہ ان سے سختی کا برتاؤ بھی کرتے تھے تو ان پر انتہائی شفقت بھی فرماتے تھے۔

صوفی صاحب کی زندگی کی گاڑی بڑی باقاعدگی سے اپنا سفر جاری رکھتی تھی۔وہ وقت کے پابند اور نہایت بااصول بزرگ تھے۔

وہ طلباء کی نمازوں کا بھی خیال رکھتے تھے۔انھیں نماز پڑھتے ہوئے دیکھتے رہتے تھے۔جو طالب علم انہاک سے نماز نہ پڑھتا یا جلدی جلدی پڑھتا، اسے ڈانٹتے اور خشوع وخضوع سے نماز پڑھنے کی تلقین فرماتے۔

کسی طالب علم کے پاس کپڑے نہ ہوتے تو اسے پہننے کے لیے کپڑے دیتے۔کسی کو پیسے کی ضرورت ہوتی تو اسے پیسے عنایت فرماتے۔

حضرات! اب میں جامعہ تعلیم الاسلام کے لائقِ احترام اصحابِ انتظام کی خدمت میں چند گزارشات پیش کرنا چاہتا ہوں اور امید رکھتا ہوں کہ ان گزارشات پر غور فرمایا جائے گا:

① ......یہ علمی اور تدریسی ادارہ ہے اور میری معلومات کے مطابق اس کی مالی حالت مستحکم ہے۔اس کی طرف سے ایک

دارالتصنیف قائم کیا جائے، جس میں مختلف دینی موضوعات سے متعلق کتابیں لکھوائی جائیں۔بعض عربی کتابوں کے ترجمے بھی کرائے جائیں۔ پھران کتابوں کو شائع کیا جائے۔ یہ ادارہ جماعت مجاہدین کے اہم اور مضبوط افکار کے حامل رکن کی پُر خلوص جدو جہد کے نتیجے میں معرضِ قیام میں آیا،مناسب ہوگا کہ اس دارالتصنیف کی طرف سے پہلی کتاب جماعت مجاہدین کے متعلق لکھی اور شائع کی جائے۔ دارالتصنیف کے بارے میں ضروری مشوروں کے لیےان چندارکان کی ایک کمیٹی بنائی جائے جوتصنیف وتالیف کاتھوڑابہت تجربہ رکھتے ہوں۔

②...... پاکستان اور ہندوستان کے متعدد تدریسی اداروں کے ماہانہ مجلّے جاری ہیں جنھیں ان اداروں کے ترجمان کی حیثیت حاصل ہے۔ جامعہ تعلیم الاسلام کی طرف سے بھی ایک مجلّے کا اجرا کیا جائے بلکہ قاضی محمد اسلم سیف کی ادارت میں شائع ہونے والے پہلے مجلّے ''تعلیم الاسلام'' کی دوبارہ اشاعت شروع کردی جائے۔ اس میں علمی اور تحقیقی نوعیت کے مضامین شائع کیے جائیں۔ جامعہ کے اساتذہ بھی مضامین لکھیں۔ طلباء کی بھی تحریری تربیت کی جائے۔ ہر مہینے جامعہ کے متعلق اس میں ضروری معلومات درج کی جائیں۔

③......جامعہ میں فتاویٰ نویسی کے سلسلے میں دارالافتاء کا مستقل شعبہ قائم کیا جائے۔ جوفتویٰ جاری کیا جائے اس کی ایک نقل سائل کو دی جائے اور دو یا تین نقلیں دفتر میں رکھی جائیں، یہ فتوے جامعہ کے مجلّے میں بھی شائع کیے جائیں۔

④...... جامعہ سے فارغ التحصیل ہونے والے ہر طالب علم سے کسی موضوع پر مقالہ لکھایا جائے جوکم سے کم سوصفحات پر مشتمل ہو اوراس کا نگران ان صاحب کو بنایا جائے جوتصنیف وتالیف سے دلچسپی رکھتے ہوں۔

⑤......طلباء کے لیے روزانہ اخبار ضرور لیے جائیں، جن کا وہ لائبریری میں بیٹھ کرمطالعہ کریں اور دنیا کے حالات سے باخبر رہیں۔

⑥...... جامعہ میں طلباء کو انگریزی پڑھانے کا بھی انتظام کیا جائے۔

⑦......طلباء کے لیےاردوادب کی کتابوں کا مطالعہ لازمی قرار دیا جائے تاکہ ان کی اردوتحریر میں نکھار پیدا ہواور یہ قلم وقرطاس کے ذریعے سے خوب صورت انداز میں اپنے مافی الضمیر کا اظہار کرسکیں۔

⑧......نبی ﷺ کی سیرتِ طیبہ کے مطالعے کا بھی اہتمام ہونا چاہیے۔ان کتابوں میں قاضی محمد سلیمان منصور پوری کی رحمۃ للعالمین، علامہ شبلی اور سید سلیمان ندوی کی سیرت النبی، مولانا صفی الرحمٰن مبارک پوری کی الرحیق المختوم، مولانا عبدالرؤف دانا پوری کی اصح السیر اور بعض دیگر مصنفین کرام کی تصانیف شامل ہوں۔ ان کتابوں میں معلومات کی فراوانی کے ساتھ ساتھ علم وادب کی رعنائیاں پوری شان سے کارفرمائیں۔

حضرات! آج کی گفتگو کی آخری گزارش میں یہ کرنا چاہتا ہوں کہ صوفی عبداللہ صاحب نہ صرف پاکستان بلکہ پورے برصغیر کی تدریسی تاریخ کا عظیم ترین عنصر تھے۔ وہ زیادہ تعلیم تو حاصل نہ کرسکے لیکن انھوں نے کتاب وسنت کی تعلیم کے جوادارے قائم کیے ان کی روشنی سے پورا علاقہ منور ہوا۔ وہ زہد وعبادت کا چلتا پھرتا پیکر تھے۔ ان کے حریم قلب میں ہرآن خشیتِ الٰہی کا علَم لہراتا رہتا تھا۔ وہ ولیِ کامل اور مستجاب الدعوات بزرگ تھے، جنھوں نے اپنے ہاتھ سے اس جامعہ کی بنیاد رکھی۔ وہ اب سے ۳۹ سال قبل (یعنی ۲۸/اپریل ۱۹۷۵ءکو) اس دنیائے فانی سے رخصت ہوئے اوراسی جامعہ کے ایک کونے میں ابدی نیند سو رہے ہیں۔ آیئے سب مل کر اللہ سے ان کے لیے مغفرت کی دعا کریں اور پروردگارِ عالَم سے کامل عجز وعاجزی کے ساتھ ملتجی ہوں کہ وہ صوفی صاحب کے جاری کردہ اس تدریسی ادارے کی نگہبانی فرمائے اور اس میں تا ابد قرآن وحدیث کی خدمت کے چشمے ابلتے رہیں، آمین یارب العالمین!



خدمات محدثین

طائفہ منصورہ اہل حدیث کی مساعی مشکورہ پر ائمہ اعلام کا خراج تحسین

عبدالجبار سلفی

چوتھی صدی ہجری کے معروف فقیہ حضرت امام ابو حاتم محمد بن حبان اپنی صحیح میں اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا بیان کرنے کے بعد طائفہ منصورہ اہل حدیث کو ان الفاظ میں خراج تحسین پیش کرتے ہیں:

''پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے مصطفین اور اخیار صلوات اللہ علیہم اجمعین کے (فرمودات کو قلم بند کرنے اور انھیں ان کی اصلی صورت میں لوگوں کے سامنے پیش کرنے کے) لیے ایک جماعت کو چن لیا اور انھیں اپنے ابرار کی سنن و آثار کو اپنے اوپر لازم سمجھنے والوں کو راستوں پر چلنے کی ہدایت عطا کی۔ اوران کے دلوں کو ایمان سے مزین کر دیا اوران کی زبانوں کو اپنے دین کے اصول ومبادیات کی تشریح اور اپنے پیغمبر ﷺ کی سنن کی پیروی اور تبلیغ پر لگا دیا چنانچہ اُنھوں نے آراء الرجال ترک کر کے سنن نبویہ کو جمع کرنے اوران میں تفقہ (سمجھ بوجھ) حاصل کرنے کے لیے گھر بار اور وطن عزیز کو چھوڑا اور وہ سواریوں پر سوار ہو کر طلب حدیث کے لیے نکل پڑے اوراسے حاصل کر کے دم لیا اوراس سلسلے میں وہ رُواۃِ حدیث کے پاس گئے اوران سے جو کچھ سنا اسے قلم بند کر لیا اور پھر اُس پر آپس میں مذاکرہ اور مناقشہ کیا اوراس میں سمجھ بوجھ حاصل کر کے اسے اصل بنایا اور اس سے فروعات کا عطر کشید کیا اور اُنھوں نے ہی متصل احادیث سے مرسل احادیث کو اور منفصل سے موقوف کو اور منسوخ سے ناسخ کو مفسوخ (فسخ شدہ) سے محکم کو اور مجمل سے مفسر کو اور مہمل سے مستعمل کو اور طویل سے مختصر کو اور چھانٹے ہوئے آثار سے چھپکے ہوئے آثار کو اور خصوص سے عموم کو اور منصوص سے دلیل کو اور مباح سے مزجور (جس کے ارتکاب پر شارع نے ڈانٹ پلائی ہو) کو اور مشہور سے غریب کو اور ارشاد سے فرض کو اور ایعاد (جن اعمال پر وعید ہے) سے حتمی اعمال کو اور مجروحین رواۃ سے عدول کو اور متروکین سے ضعفاء کو اور مجہول سے معمول کی کیفیت کو اور مخذول سے محروف کو اور منحول (غلط طور پر منسوب) سے مقلوب (اصل کے برعکس) کو اور مدلسین کی تدلیس کے نشانات کو واضح اور جدا جدا کر دیا اور اللہ نے ان کے ذریعے مسلمانوں کے دین کی حفاظت کی اور اسے عیب جوؤں کی بدگوئیوں سے بچایا۔ اور انھیں جھگڑوں کے وقت فیصل ٹھہرایا اور اندھیروں میں انھیں مصابیح الدُّجٰی بنایا چنانچہ وہ انبیاء کرام علیہم السلام کے وارث اور اصفیاء کے محبوب ہیں۔''

ان کی ایسی ہی مساعی مشکورہ کی وجہ سے حضرت خواجہ معین الدین اجمیری نماز تہجد میں دعا کیا کرتے تھے:

''اللھم احشرنی مع اھل الحدیث وزمرتھم یوم القیامۃ.''

(تذکرۃ الصالحین از شمس الدین اکبر آبادی)

''اے اللہ قیامت کے دن میرا حشر اہل حدیث اوران کی جماعت کے ساتھ ہو۔''

اور چوتھی صدی ہجری ہی کے مشہور امام قاضی حسن بن عبدالرحمان رامہرمزی رحمہ اللہ اپنی کتاب ''المحدث الفاصل'' (ص:۱۵۹، ۱۶۰) میں

طائفہ منصورہ اہل حدیث کا دفاع کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''حدیث سے بیر اور پرخاش رکھنے اور اہل حدیث سے بغض رکھنے والے لوگوں میں سے کچھ افراد نے اصحاب حدیث کی عزت گھٹانے اور انھیں لوگوں کی نظروں میں گرانے کا گھناؤنا عمل شروع کر رکھا ہے اور ان کی مذمت کرنے اور ان کے سر پر بہتان تھوپنے میں حد سے گزر چکے ہیں جب کہ اللہ تعالیٰ نے علم حدیث کو شرف بخشا ہے اور اس کے حاملین کو فضیلت عطا کی ہے اور اسے ہر مجلس کا حکم اور فیصل بنایا ہے اور اسے ہر علم پر اوّلیت عطا کی ہے اور اس علم کے حاملین اور اس سے سروکار رکھنے والوں کا نام بلند کر دیا ہے چنانچہ اہل حدیث دین کی عمارت کا مرکزی ستون ہیں اور دلائل و براہین کے مینار ہیں۔ وہ اس اعزاز اور فضیلت کے مستحق کیوں نہ ہوں؟ جب کہ اُنھوں نے اُمت محمدیہ کے دین کی پہرے داری کا فریضہ سر انجام دیا ہے اور قرآن مجید کے شان نزول اور اس کے ناسخ و منسوخ اور محکم اور متشابہ کو قلم بند کیا ہے اور ہر اُس خبر کو محفوظ کیا ہے جس میں حضرت رسول اللہ ﷺ کی تعظیم و توقیر بیان ہوئی ہے چنانچہ اُنھوں نے ہی آپ ﷺ کے مشروع اعمال کو نقل اور مشاہدات کو مدوّن کیا ہے اور آپ ﷺ کی نبوت کی حقانیت پر دلائل و اعلام سے بھر پور تصانیف لکھی ہیں اور آپ ﷺ کی عزت اور آپ ﷺ کے آباء و اجداد اور آپ ﷺ کے قبیلے کے فضائل و مناقب (جمع کرنے کے لیے دنیا بھر کے کتب خانے کھنگال دیے ہیں) اور اس مبارک مقصد کی خاطر اُنھوں نے ملنے والی روایات کی تحقیق کی ہے اور اس کا ثبوت بہم پہنچایا ہے اور انبیاء علیہم السلام کی سیرتیں اور شہداء کے مراتب اور صدیقین کے واقعات بیان کرنے کا شرف حاصل کیا ہے اور اُنھوں نے اللہ کے پیارے رسول حضرت محمد ﷺ کے سفر و حضر اور اقامت و رخصت اور سونے و جاگنے اور اشارہ و تصریح اور گفتگو و خاموشی اور بیٹھنے اُٹھنے اور کھانے پینے اور سواری و لباس اور رضا مندی و ناراضی اور انکار و قبول جیسے تمام احوال کو قلم بند کیا ہے حتیٰ کہ آپ ﷺ کے ناخن تراشنے اور اور بلغم خارج کرنے اور اسے پھینکنے کی جہت کو بھی بیان کر دیا ہے اور ان مبارک کلمات کو بھی قلم بند کر لیا جو آپ ﷺ ہر موقع پر کہتے اور اس پر عمل کرتے تھے یہ سب کچھ اُنھوں نے آپ ﷺ کی ذات سے عقیدت و محبت اور آپ کی تعظیم و توقیر کی خاطر کیا ہے اور اس مقصد کے لیے بھی کہ لوگوں کے دلوں میں آپ ﷺ کے فرامین کی اہمیت اور قدر و قیمت جاگزیں ہو سکے لہٰذا جو شخص اپنے دل میں اسلام کا حق اور حضرت رسول اللہ ﷺ کا احترام رکھتا ہے وہ اس گھٹیا حرکت کے ارتکاب سے بلند ہے کہ وہ ان ہستیوں کی تحقیر کرے جن کو اللہ نے عزت عطا کی ہے اور ان کے مرتبے کو بلند کیا ہے اور ان کی دلیل کو غالب کیا ہے اور ان کی فضیلت کو منفرد بیان کیا ہے بلکہ وہ شخص تو اس سیڑھی پر قدم رکھنا بھی گوارا نہیں کرتا جو حضرت نبی کریم ﷺ کے خلفاء اور وحی جلی و خفی کے متبعین اور قرآن و احکام کے ناقلوں پر طعن و تشنیع کی طرف لے جاتی ہو اور نہ ہی وہ ان لوگوں کو برا کہنے کا سوچ سکتا ہے جن کا تذکرہ اللہ نے ان الفاظ میں کیا ہے:

﴿وَ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ رَّضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَ رَضُوْا عَنْهُ﴾ [التوبة: ۱۰۰]''

مجدد القرن الثامن امام ابو العباس احمد بن عبد الحلیم المعروف امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ مسلک اہل حدیث کی صداقت پر منفرد اِستدلال کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''اہل بدعت میں سے ہر فریق دعویٰ کرتا ہے کہ وہ شریعت کو مضبوطی سے تھامے ہوئے ہے اور حضرت محمد رسول اللہ

ﷺ جس دین حق کو لے کر اُٹھے تھے وہ اسی کا اعتقاد رکھتا ہے اور اس کی طرف ہی منسوب ہے جب کہ اللہ تعالیٰ نے اہل حدیث وآثار کے علاوہ دوسروں کے حق پر ہونے اور ان کے اعتقاد کے صحیح ہونے سے انکار کر دیا ہے کیوں کہ بعد والے اہل حدیث اپنے سے پہلے اہل حدیث سے صدی در صدی اپنا دین حاصل کرتے کرتے تابعین عظام تک جا پہنچے جنھوں نے اپنا دین حضرت نبی کریم ﷺ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے حاصل کیا اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے حضرت رسول اللہ ﷺ سے۔ جس دین مستقیم اور سیدھے راستے کی حضرت رسول اللہ ﷺ نے لوگوں کو دعوت دی ہے اس کی معرفت حاصل کرنے کا اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں کہ اسی راستے پر چلا جائے جس پر اصحاب الحدیث چلے۔

اور وہ چیز جو اہل حدیث کے حق پر ہونے کی نشان دہی کرتی ہے وہ یہ ہے کہ تم ان کی جدید اور قدیم تمام کتابوں کا اوّل تا آخر مطالعہ کر لو تو باوجود ان کے شہروں اور زمانوں کے مختلف ہونے اور ان کے گھروں کے دور دور ہونے اور ہر ایک کے مختلف براعظموں میں مقیم ہونے کے اعتقاد کے مسئلے میں انھیں ایک ہی طرز اور ایک ہی منہج پر متفق پاؤ گے وہ ایک ہی راستے پر چلتے نظر آئیں گے نہ تو وہ اس سے سحر مونحرف ہوں گے اور نہ ہی وہ دوسرے طرق کی طرف مائل ہوں گے اس مسئلے میں ان کے دل ایک ہیں اور دین کے اُصول میں ان کی تحریروں میں معمولی سا بھی اختلاف یا فرق نظر نہیں آئے گا بلکہ اگر تم ان کی زبانوں سے نکلے ہوئے تمام اقوال اور ان کے اسلاف کے حوالے سے لکھے ہوئے مسائل کو جمع کر کے موازنہ کرو گے تو تم انھیں یوں پاؤ گے گویا وہ ایک ہی دل سے نکلے ہیں اور ایک ہی زبان پر جاری ہوئے ہیں۔ کیا اس سے بڑھ کر کسی کے حق پر ہونے کی دلیل ہوسکتی ہے؟ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

’’تو کیا وہ قرآن میں غور وفکر نہیں کرتے اور اگر وہ غیر اللہ کی طرف سے ہوتا تو وہ اس میں بہت زیادہ اختلاف پاتے۔‘‘ (النساء: ۸)

اور دوسری جگہ فرمایا:

’’اور سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑ لو اور جدا جدا نہ ہو جاؤ اور اپنے اوپر اللہ کی نعمت یاد کرو جب تم دشمن تھے تو اس نے تمھارے دلوں کے درمیان الفت ڈال دی تو تم اس کی نعمت سے بھائی بھائی بن گئے اور تم آگ کے ایک گڑھے کے کنارے پر تھے تو اس نے تمھیں اس سے بچا لیا، اس طرح اللہ تمھارے لیے اپنی آیات کھول کر بیان کرتا ہے تاکہ تم ہدایت پاؤ۔‘‘ (آل عمران: ۱۰۳)

عقائد کے باب میں اہل حدیث کے باہمی اتفاق کا سبب یہ ہے کہ اُنھوں نے اپنا دین کتاب وسنت اور صحیح اسناد سے حاصل کیا ہے اور اس عمل نے ان کو اتفاق اور باہمی الفت کا وارث بنا دیا ہے۔ اور اہل بدعت نے اپنا دین اپنی اپنی عقلوں سے حاصل کیا ہے اور اس عمل نے ان کو باہمی فرقہ بندی اور باہمی اختلاف کا وارث بنا دیا ہے۔ اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ ثقہ اور مضبوط حفاظ حدیث کی روایات میں بہت کم اختلاف دیکھنے میں آیا ہے، اگر ان میں کسی لفظ یا جملے میں اختلاف ہوا ہے تو وہ نہ دین میں مضر ہے اور نہ قادح جب کہ معقولات اور خیالات اور نظریات میں بہت کم حد تک اتفاق نظر آیا ہے۔ ہم نے دیکھا ہے کہ جدید اور قدیم اصحاب حدیث وہ ہستیاں ہیں جنھوں نے ان آثار واحادیث کی طلب میں باقاعدہ سفر کیا اور اسے حاصل کر لیا اور انھیں ان کے گہواروں سے حاصل کیا اور انھیں حفظ کیا اور ان پر نازاں ہوئے اور لوگوں کو ان کی پیروی کی دعوت دی

اوران کے مخالفین پر قدغن لگایا اور یہ آثاران کے پاس کافی مقدار میں جمع ہوگئے اور وہ ان کے ساتھ شغف کی بنا پر یوں مشہور ہوئے جس طرح دیگر ماہرین اپنی ایجادات اور مصنوعات کی بہ دولت مشہور ہوتے ہیں۔ پھر ہم نے ایسی قوم دیکھی جو انھیں حفظ کرنے اور ان کی معرفت حاصل کرنے سے کنی کترا گئی اور اس فن کی مشہور اور صحیح احادیث و آثار کی اتباع سے ہٹ گئی اور اس نے اہل حدیث کی صحبت سے بے پروائی کی اور ان پر اور علم حدیث پر طعن وتشنیع شروع کردی اور لوگوں کو صحیح احادیث سے بدظن کرنے کے لیے احادیث کے مجموعوں کو کباڑ خانوں (اور پنسار خانوں سے) تشبیہ دی اور ان کے حاملین کو بہت برا کہا اور انھیں قبیح القاب دیے تو کچھ انھیں ناصبی کہنے لگے اور کچھ مشبہ اور کچھ حشویہ اور کچھ مجسمہ کہنے لگے۔ سو ہم نے آفتاب نصف النہار کی طرح روشن دلائل اور پہاڑوں کی طرح مضبوط شواہد کی بنا پر پہچان لیا کہ انھیں اس طرح کے القاب دینے والے تمام فرقے حقیقتاً خود ان القاب کے مستحق ہیں۔'' (مختصر الصواعق ،ص:۴۹۶-۴۹۹)

صدیوں قبل امام احمد بن سنان القطان نے اہل حدیث کے بارے میں کتنی سچی بات کہی:

''لیس فی الدنیا مبتدع الا وھو یبغض اھل الحدیث واذا ابتدع الرجل نزع حلاوۃ الحدیث من قلبه .''(معرفة علوم الحدیث)

''دنیا میں کوئی ایسا بدعتی نہ ہوگا جو اہل حدیث سے بغض نہ رکھتا ہو اور جب کوئی آدمی بدعتی ہوجاتا ہے تو اس کے دل سے حدیث کی حلاوت کھینچ لی جاتی ہے۔''



بقیہ : دنیا عیسائیت کی زد میں

مطابق ایشیا اور جنوب مشرقی ایشیا میں عیسائیت کے زیادہ کام کرنے کی ضرورت ہے۔

اکیسویں صدی میں عیسائیت کے تبلیغی کام کو آگے بڑھانے کے لیے جونئی صف بندی ہوئی ہے، اس کے مطابق عیسائی تنظیموں نے دنیا کو مختلف حصوں میں تقسیم کیا ہے، اس تقسیم میں سب سے پہلے وہ ملک آتے ہیں جہاں عیسائی مشنریوں کو کسی کام کی رکاوٹ نہیں، دوسرے نمبر پر وہ ملک آتے ہیں جہاں ان کو تھوڑی بہت مزاحمت کا سامنا ہے اور تیسرے نمبر پر وہ آتے ہیں جہاں عیسائیت کو تا حال کوئی خاص کامیابی حاصل نہیں ہوسکی۔

ماضی میں تیس سالوں کے اندر امریکا اور یورپ میں ایسے ادارے وجود میں آئے ہیں جنھوں نے دنیا بھر میں رہنے والے انسانوں کی عادات، ثقافت اور لغات سے آگاہی حاصل کی اور پھر مشنریوں کو باقاعدہ اس کے بارے میں تعلیم دی گئی۔

ان معروضات کی روشنی میں نہ صرف عیسائیت کے مجموعی اندازِ فکر کا پتا چلتا ہے بلکہ یہ بھی واضح ہوجاتا ہے کہ عیسائی مشنریاں کتنی تیزی کے ساتھ مسلمان ملکوں کا رخ کیے ہوئے ہیں۔ نیز اس جدید اور سائنسی دور میں بھی یہ لوگ مسلمانوں اور اسلام کے متعلق کیسے نظریات کے حامل ہیں۔ اور یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ یہ مسئلہ پاکستان کا نہیں بلکہ ان دیگر اسلامی ممالک کا بھی ہے جہاں عیسائی مشنری ادارے سرگرمِ عمل ہیں۔

لہٰذا تمام مسلم ممالک کو مل بیٹھ کر امریکا اور یورپ سے اُٹھنے والے اس فکری طوفان کا مقابلہ کرنے کے لیے ایک مضبوط لائحہ عمل ترتیب دینا چاہیے۔ اور ویسے بھی اس وقت یہ بات ہماری غیرت دینی کو چیلنج کررہی ہے کہ عیسائی مختلف ملکوں سے اکٹھے ہوکر عیسائیت کا پرچار کرنے کے لیے ایک پلیٹ فارم پر متفق ہوسکتے ہیں تو آخر مسلمان فروغِ اسلام اور نفاذ اسلام کے لیے متحد کیوں کر نہیں ہوسکتے!!!

مولانا ابوالوفاء ثناء اللہ امرتسری رحمہ اللہ

حکیم آفتاب احمد قرشی

۱۹۱۹ء میں امرتسر ہندوستان میں سیاسیات کا سب سے بڑا مرکز تھا۔۱۳/اپریل ۱۹۱۹ء کو امرتسر میں جلیانوالہ باغ میں قیامت برپا ہوئی۔جلیانوالہ باغ میں جلسہ ہو رہا تھا۔ایک فرعون مزاج انگریز جنرل ڈائر فوج لے کر آیا اور کسی اعلان یا انتباہ کے بغیر پرامن عوام پر گولی چلادی۔عوام خاک وخون میں تڑپ رہے تھے اور باغ سے نکلنے کے راستے بند تھے۔ڈائر نے تو ایسی شقاوتِ قلبی اور سنگ دلی سے کام لیا کہ چنگیز اور ہلاکو کی روحیں بھی شرما گئی ہوں گی۔جلیانوالہ باغ میں کہرام مچا ہوا تھا۔زخمیوں کی آہ وپکار اور مرنے والوں کی آخری وقت کی تڑپا دینے والی صدا کا انگریز کے دل پر کوئی اثر نہ ہوا۔وہ دراصل عوام پر برطانوی حکومت کی ہیبت اور دبدبہ طاری کرنا چاہتا تھا۔گولی چلتی رہی اور جسم تڑپ تڑپ کر گرتے رہے۔ڈائر جلیانوالہ باغ میں یہ قیامت ڈھا کر چلا گیا۔جلیانوالہ باغ کے اس خونی واقعہ کی اطلاع سے ملک بھر میں آگ لگ گئی اور اس سے تحریک آزادی کے نئے دور کا آغاز ہوا۔اس ظلم وتشدد کے خلاف عوام نے علم بغاوت بلند کیا اور حقیقت یہ ہے کہ جلیانوالہ باغ کے واقعہ سے برطانوی ہیبت ودبدبہ ختم ہوگیا۔

حکیم مشرق علامہ اقبال جلیانوالہ باغ کے واقعہ سے بے حد متاثر ہوئے۔ان کا دردمند دل تڑپ اُٹھا۔ان کے سرخ وسپید چہرے پر آنسو موتیوں کی طرح چمک رہے تھے۔علامہ ڈاکٹر محمد اقبال جلیانوالہ باغ کے واقعہ کو اپنے اشعار میں خلوص ومحبت سے خراج عقیدت پیش کیا۔جلیانوالہ باغ کی اس قیامت کے بعد امرتسر میں تین بڑی سیاسی جماعتوں: خلافت، کانگرس اور مسلم لیگ نے سالانہ جلسے کرنے کا فیصلہ کیا تاکہ ہندوستان کے مختلف صوبوں سے شمع آزادی کے پروانے جلیانوالہ باغ کے شہیدانِ آزادی کو خراج عقیدت پیش کریں۔امرتسر میں یہ سیاسی اجتماعات اس شان وشوکت سے ہوئے کہ چشم فلک نے ایسا نظارہ نہ دیکھا ہوگا۔سیاسی لیڈر، مقتدر راہ نما اور ممتاز علماء ان جلسوں میں شریک تھے۔علامہ اقبال، مسٹر جناح، گاندھی، موتی لال نہرو، سی آر داس، مولانا ابوالکلام آزاد غرض کہ ہندوستان کی ہر جلیل القدر شخصیت شریک بزم تھی۔مگر مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی کی کمی شدت سے محسوس ہو رہی تھی۔دونوں بھائی اسیر تھے۔مسلم لیگ کے اجلاس کے پہلے روز مولانا ثناء اللہ صدر مجلس انتظامیہ کی حیثیت سے خطبہ پڑھ رہے تھے کہ تار سے یہ اطلاع ملی کہ علی برادران رہا کر دیے گئے اور اجلاس میں شرکت کے لیے امرتسر آرہے ہیں۔جلسہ کے صدر مسیح الملک حکیم اجمل خاں کو یہ تار موصول ہوا۔اُنھوں نے یہ تار حاضرین کو سنایا اور عوام نے خیر مقدم کیا اور فلک شگاف نعروں سے فضا گونج اُٹھی۔علی برادران ان دنوں بے تاج بادشاہ تھے اور لوگوں کے دلوں پر حکمرانی کرتے تھے۔وہ امرتسر پہنچے تو ان کا شاہانہ استقبال کیا گیا۔ایسا استقبال ہندوستان کی تاریخ میں کسی کو نصیب نہیں ہوا ہوگا۔مولانا محمد علی کانگرس کے جلسہ میں پہنچے تو گاندھی، موتی لال نہرو، سی آر داس اور پنڈت مدن موہن مالواہ نے پنڈال سے باہر ان کا استقبال کیا۔عوام ان پر نثار ہو رہے تھے۔آزادیِ وطن کے ہیرو علی برادران سالہا سال کی قید وبند کے بعد باہر آئے تھے۔

کانگرس کے جلسہ کے بعد مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی مسلم

لیگ کے جلسہ میں آئے۔اس وقت ''اخوت'' کے مدیر فضل الرحمان تقریر کر رہے تھے۔شان دار پنڈال، لاکھوں کا مجمع ،عوام کا جوش وخروش، بڑا اچھا انتظام۔مسلم لیگ کے جلسہ میں علی برادران کا والہانہ استقبال کیا گیا۔دوسال پہلے مولانا محمد علی کو مسلم لیگ کا صدر منتخب کیا گیا تھا مگر وہ قید تھے۔اجلاس کی صدارت مولانا محمد علی کی بجائے مولانا کی شبیہ (تصویر) نے کی تھی۔اب مولانا محمد علی مسلم لیگ کے اجلاس کی زینت تھے۔مسلم لیگ کے سالانہ جلسہ کے صدر مسیح الملک حکیم محمد اجمل خاں تھے۔مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی اجلاس میں تشریف لائے۔تلاوتِ قرآن پاک کے بعد حکیم مشرق علامہ اقبال کھڑے ہوئے تو لوگوں میں خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی۔روشنی میں علامہ اقبال کا خوب صورت چہرہ چمک رہا تھا۔علامہ اقبال نے علی برادران کے خیر مقدم میں شعر پڑھے۔مجمع پر سکوت کا عالم طاری تھا۔علامہ اقبال کے ایک ایک شعر پر داد دی جا رہی تھی اور مکرر مکرر کی صدا بلند ہو رہی تھی۔علامہ اپنے شعر کو دہرا دیتے تھے مگر تشنہ کام سیر نہیں ہو رہے تھے۔اقبال کے شعر وسخن کے موتیوں اور جواہر ریزوں کو اہل نظر سمیٹ رہے تھے۔علامہ اقبال کا دل کش لہجہ، ان کا شیریں ترنم، لاکھوں کا مجمع اور سکوت کا عالم، یوں معلوم ہوتا تھا کہ فرشتوں کی مجلس ہے اور ہاتف غیبی لحنِ داودی میں نغمہ ریز ہے۔علامہ اقبال نے اس اجتماع میں جو شعر پڑھے وہ ان کے مطبوعہ کلام کی زینت ہیں۔

مسلم لیگ کا جلسہ انتظامات اور کارکردگی کے اعتبار سے بہتر تھا۔جلسہ ختم ہوا تو تمام اکابر نے انتظامات پر مولانا ثناء اللہ امرتسری کو مبارک باد دی۔مولانا ثناءاللہ مسلم لیگ کی مجلس استقبالیہ کے صدر تھے۔اُنھوں نے مسلم لیگ اور دیگر جماعتوں کے جلسوں کو کامیاب بنانے میں بڑا حصہ لیا۔اُنھوں نے مسلم لیگ کے جلسہ کے سلسلے میں شب وروز کام کیا۔مولانا ثناءاللہ ممتاز عالم دین کی حیثیت سے مشہور تھے۔مگر مسلم لیگ کے جلسہ کے بعد یہ حقیقت آشکار ہوئی کہ مولانا بڑے منتظم ہیں۔صدر استقبالیہ کی حیثیت سے ان کا خطبہ شاہکار کی حیثیت رکھتا تھا۔اُنھوں نے مسئلہ خلافت پر بڑے فاضلانہ انداز میں اظہارِ رائے کیا۔اور ملک کی سیاسی صورتِ حال کا جائزہ لیا۔مولانا کا خطبہ استقبالیہ ان کی گہری سیاسی بصیرت کا آئینہ دار تھا۔اس خطبہ استقبالیہ کو اہل نظر نے بے حد سراہا۔مولانا ثناءاللہ مسلم لیگ سے پہلے ہی وابستہ ہو چکے تھے۔۱۹۱۸ء میں ترکی کی شکست کے بعد مسلم لیگ کا اجلاس ۱۹۱۸ء میں دہلی میں مولوی فضل الحق کی صدارت میں منعقد ہوا۔مولانا ثناء اللہ نے اس اجلاس میں ولولہ انگیز تقریر کی اور ترکوں کو ہندی مسلمانوں کی بھرپور حمایت کا یقین دلایا۔۱۹۲۰ء میں ہندوستان بھر سے ہندو اور مسلم لیڈروں کا ایک نمائندہ وفد وائسرائے سے ملا تو اس میں بھی مولانا ثناءاللہ شامل تھے۔اس وفد میں گاندھی، مولانا محمد علی، پنڈت نہرو، حکیم اجمل خاں اور مسٹر جناح شامل تھے۔اس وفد نے وائسرائے سے ترکی اور خلافت کے بارے میں مطالبات کیے۔اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ مولانا کا سیاست میں کس قدر بلند مقام تھا۔مولانا ثناءاللہ نے مسلم لیگ سے ایسا رشتہ جوڑا کہ زندگی کے آخری لمحات تک اسی جماعت سے رابستہ رہے۔سیاسیات میں مختلف ادوار آئے مگر مسلم لیگ سے ان کی وابستگی میں کوئی فرق نہ آیا۔اُنھوں نے اپنی بھرپور اور طویل سیاسی زندگی کے ہر موڑ پر مسلم لیگ کی بھرپور حمایت کی۔اُنھوں نے دوسری سیاسی جماعتوں: کانگرس اور جمعیت علمائے ہند میں بھی کام کیا۔مگر ان کی بنیادی وفاداری ملت کے اجتماعی مفاد اور مسلم لیگ ہی سے تھی۔اُنھوں نے ملی مفاد کو کبھی نظر انداز یا قربان نہیں کیا۔

کانگرس نے مسلمانوں کے مفاد کو مجروح کیا تو مولانا ثناءاللہ نے کانگرس کو خیر باد کہہ دیا۔نہرو رپورٹ میں کانگرس راہ نماؤں نے اپنے عزائم کو واشگاف انداز میں بیان کر دیا تھا۔نہرو رپورٹ ہندوستان کا آئینی خاکہ تھا۔اس رپورٹ کی اشاعت کے بعد کسی فہمیدہ اور دردمند مسلمان کے لیے کانگرس میں رہنے کی گنجائش نہ

رہی۔مولانا ثناءاللہ نے محمد علی جناح اور مولانا محمد علی کے نقش قدم پر چلتے ہوئے کانگرس کوالوداع کہا۔

علامہ اقبال نے ۱۹۳۰ء میں الہ آباد میں ہندوستان میں اسلامی ریاست پاکستان کا تصور پیش کیا تو مولانا ثناءاللہ نے اپنے اخبار میں اس کی پرزور حمایت کی اور کئی مقالات اس کی حمایت میں لکھے۔یہ حقیقت بڑی خوش کن ہے کہ علامہ اقبال کی تجویز کا خیر مقدم کرنے والوں میں علماء اور نوجوان پیش پیش تھے۔مولانا ثناءاللہ کے علاوہ بریلوی مسلک کے مشہور بزرگ مولانا نسیم الدین مرادآبادی نے بھی اپنے امرتسر جریدہ میں علامہ اقبال کی اس تجویز کی حمایت میں کئی مضامین لکھے۔مولانا ثناءاللہ نے مسلم لیگ کی حمایت کا سلسلہ جاری رکھا۔۱۹۴۰ء میں مسلم لیگ نے قراردادِ لاہور منظور کر کے اپنی منزل معین کر لی تو مولانا ثناءاللہ بڑے شاداں اور مسرور تھے۔

آپ کی تحریک پر ۱۹۴۶ء میں جماعت اہل حدیث کلکتہ کے زیر اہتمام ایک عظیم الشان کانفرنس ہوئی۔جس میں ہندوستان بھر کے اکابر علماء شریک ہوئے۔نام وَر عالم دین مولوی محمد ابراہیم سیالکوٹی صدر مجلس تھے۔اس جلسہ میں مولانا ثناءاللہ کی تجویز پر اتفاق رائے سے فیصلہ ہوا کہ جماعت اہل حدیث مسلم لیگ سے متفق ہے اور مسلم لیگ میں شمولیت نہ صرف اپنا اجتماعی وقار سمجھتی ہے بلکہ اسے اسلامیانِ ہند کی واحد نمائندہ جماعت تسلیم کرتی ہے۔اس تاریخی فیصلہ کا سہرا مولانا محمد ابراہیم سیالکوٹی اور مولانا ثناءاللہ کے سر تھا۔یہ تاریخی فیصلہ تحریک پاکستان میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔اس فیصلہ سے مسلم لیگ کو برصغیر کے گوشہ گوشہ میں مخلص اور فعال سیاسی کارکن میسر آئے۔

مولانا ثناءاللہ کو ۱۹۱۸ء میں مسلم لیگ کے جلسہ میں قائداعظم سے ملنے کا موقع ملا۔۱۹۱۹ء میں امرتسر میں مسلم لیگ کے جلسہ میں صدر استقبالیہ خود مولانا تھے۔وہ قائد کی ذہانت،فراست،خلوص،دردمندی، حقیقت پسندی اور معاملہ فہمی سے بے حد متاثر ہوئے۔اُنھوں نے مسٹر جناح کو عظیم قائد پایا۔قائداعظم کی عظمت و سربلندی کے نقوش مولانا کے دماغ پر رقم ہوئے مولانا ثناءاللہ نے اپنی چالیس ۴۰ سالہ سیاسی زندگی میں ہمیشہ قائداعظم کی بھرپور حمایت کی۔مولانا بہت بڑے عالم دین تھے۔مسلم لیگ اور قائد کے لیے ان کی حمایت اور تائید متاع بیش بہا تھی۔جس سے مسلم لیگ بہرہ مند ہوئی۔

مولانا ثناءاللہ کے حکیم مشرق علامہ اقبال سے بھی گہرے مراسم تھے۔وہ حکیم مشرق اور ان کے گراں قدر اوصاف کے بے حد معترف تھے۔علامہ اقبال نے اسلامی قومیت کا جو تصور پیش کیا تھا وہ مولانا کو بے حد عزیز تھا۔مولانا ثناءاللہ کی رائے میں مسلمان ایک اور جداگانہ قوم کی حیثیت رکھتے تھے وہ متحدہ قومیت کے مخالف تھے۔اور اسے مسلمانوں کے لیے شدید خطرہ سمجھتے تھے۔

مولانا ثناءاللہ علامہ اقبال کی شاعری کے بے حد مداح تھے۔گاہِ گاہِ اپنی تقاریر میں علامہ اقبال کے اشعار پڑھتے۔اور سامعین میں جذبہ اور ولولہ پیدا کرتے۔

مولانا ثناءاللہ کی ملی اور سیاسی خدمات کا دائرہ مسلم لیگ تک محدود نہ تھا وہ خلافت،جمعیت علماء ہند اور کانگرس کے سرکردہ راہ نما تھے۔دہلی میں خلافت کمیٹی کے قیام کے لیے جو تاسیسی اجلاس ہوا تھا مولانا اس میں شریک تھے وہ خلافت کے بانی ارکان میں سے تھے۔اُنھوں نے تحریکِ خلافت میں پرجوش حصہ لیا۔اور جب تک خلافت کمیٹی زندہ کارفرما رہی وہ اس کے پرجوش رکن رہے۔

مولانا ثناءاللہ جمعیت علمائے ہند کے بانیوں میں سے تھے ان کی دعوت پر علماء نے خانقاہوں اور حجروں کو خیرباد کہہ کر میدانِ سیاست کا رُخ کیا تھا اور دارورسن کو دعوت دی تھی۔وہ جمعیت علماء ہند کے فعال راہ نما تھے۔مگر جب جمعیت علماء ہند نے کسی معاہدہ یا شرائط کے بغیر کانگرس کی حمایت اور مسلم لیگ کی مخالفت شروع کر دی تو وہ جمعیت علماء ہند سے دست کش ہو گئے۔مولانا نے اپنے اخبار ''اہل حدیث'' کی اشاعت ۱۳ فروری ۱۹۴۲ء میں جمعیت علماء سے اپنی وابستگی اور پھر علیحدگی کے اسباب پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔

مولانا ثناءاللہ کا ایک بڑا کارنامہ اہل حدیث جماعت کو سیاسیات میں حصہ لینے پر آمادہ کرنا تھا۔ برطانوی حکومت اہل حدیث حضرات کو اپنا حریف سمجھتی تھی۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں اہل حدیث پیش پیش تھے۔قبائلی علاقوں میں حضرت سید احمد کی جماعت مجاہدین کی جنگی سرگرمیاں انگریزوں کے لیے خطرے کا موجب تھیں۔ برطانوی حکومت نے صادق پور اور انبالہ میں اہل حدیث کے خلاف مقدمے چلائے اور اس قدر ظلم وتشدد کیا کہ الامان! بیسیوں اکابر نے قید وبند کے مصائب برداشت کیے۔سیکڑوں کی جائیدادیں ضبط اور ان کے مکان کھدوا دیے گئے۔ ہندوستان میں اہل حدیث یا وہابی کہلانا ایک جرم تھا۔ اس صورتِ حال سے اہل حدیث سیاسیات سے دست کش ہو گئے۔ سرسید اور دوسرے مسلمان زعماء بھی سیاسیات میں حصہ لینے کے مخالف تھے۔ پھر حالات نے نئی کروٹ لی مسلمانوں نے سیاسیات میں دلچسپی لینی شروع کی مسلم لیگ کا قیام عمل میں لایا گیا۔ بعدازاں جنگ بلقان جنگ طرابلس اور مسجد مچھلی بازار کان پور کی شہادت سے مسلمانوں میں سیاسی جذبات کروٹیں لینے لگے تھے جنگ عظیم میں ترکی کو شکست ہوئی۔ ترکی اور خلافت کا وجود خطرے میں تھا اس وقت دیگر علماء اور اکابر کے ساتھ مولانا ثناءاللہ میدانِ عمل میں آئے اور والہانہ انداز میں دعوت عمل دی۔ مولانا اور ان کے رفقاء نے اس دردمندی اور ولولہ سے یہ دعوت دی کہ برسوں کا بند ٹوٹ گیا اور اہل حدیث جوش وخروش سے سیاسیات کی پرخار وادی میں جادہ پیما ہوئے۔

ابتدائی حالات:

مولانا کشمیری پنڈتوں کے مشہور خانوادہ منٹو سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے والدِ ماجد شیخ خضر جو پشمینہ کے سوداگر تھے اُنھوں نے ۱۸۶۰ء میں کشمیر سے رختِ سفر باندھا اور امرتسر میں مقیم ہوئے۔ مولانا ثناءاللہ جون ۱۸۶۸ء میں امرتسر میں پیدا ہوئے، مولانا کی عمر سات سال تھی کہ والد ماجد کی سرپرستی سے محروم ہو گئے۔ اور چودہ سال کی عمر میں والدہ انتقال کر گئیں اس طرح دنیا کے اکثر مشاہیر کی طرح وہ یتیم رہ گئے۔

مولانا ثناءاللہ نے یتیمی کے مصائب دیکھے اور اُنھوں نے دنیا خود تعمیر کی۔ ابتدائی تعلیم کا حصول جاری تھا کہ یتیم ہو گئے اور انھیں حصولِ معاش کے لیے رفوگری کا فن سیکھنا پڑا۔ رفوگری کا کام نہایت توجہ اور دلچسپی سے کیا کرتے تھے۔ مولانا ثناءاللہ کی زندگی کا ایک درخشاں اُصول یہ تھا کہ اُنھوں نے جو کام بھی کیا اسے فرض سمجھ کر ذوق وشوق سے سرانجام دیا۔ مولانا ثناءاللہ چاکِ گریبان کی چارہ سازی کرتے تھے کہ ان کی زندگی میں ایک حیرت انگیز واقعہ رونما ہوا۔ ایسا انقلاب آفریں واقعہ جس نے مولانا کی زندگی کا رُخ بدل ڈالا۔ مولانا ثناءاللہ کے پاس ایک عالم دین اپنا ایک چغہ مرمت کے لیے لائے۔ مولانا ثناء اللہ نے چغہ رفو کر دیا اور اس حسن وخوبی سے کیا کہ عالم دین کو ان کا کام پسند آیا۔ عالم دین نے ثناءاللہ سے گفتگو کی ثناءاللہ نے بڑے معقول جواب دیے عالم نے تعلیم کے بارے میں دریافت کیا۔ ثناءاللہ کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو گئیں اور کہا کہ والدین انتقال کر چکے ہیں کوئی پڑھانے والا نہیں ہے۔ رفوگری سے جو کماتا ہوں اس سے گزر اوقات کرتا ہوں عالم دین نے مولانا سے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے تمھیں گراں قدر صلاحیتوں سے نوازا ہے تم میں ذہانت کا جوہر پوشیدہ ہے۔ تمھیں علم دین حاصل کرنا چاہیے۔ ان شاء اللہ تم ممتاز عالم بن جاؤ گے۔ عالم دین کی یہ بات ثناءاللہ کے دل میں اُتر گئی۔

اب انھیں شب و روز یہی خلش تھی کہ وہ اپنی تعلیم حاصل کریں اپنے حالات پر غور کرتے اور حوصلہ نہ ہوتا مگر تعلیم حاصل کرنے کے لیے بے تاب تھے۔ مولانا ثناءاللہ کی زندگی کی کئی راتیں اس کشمکش میں گزریں۔ مولانا ثناءاللہ کو اللہ تعالیٰ نے جرأت مندی سے نوازا تھا۔ وہ مہم جو اور خطر پسند تھے۔ مولانا ثناءاللہ نے جرأت سے کام لیتے ہوئے دینی تعلیم حاصل کرنے کا عزم کیا۔ مولانا ثناءاللہ نے دینی تعلیم شروع کی تو رفوگری کا پیشہ بھی جاری رکھا۔ فارسی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں اور امرتسر کے مشہور عالم مولانا احمد اللہ امرتسری کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ مولانا احمد اللہ امرتسر کے رئیس تھے۔ مولانا ثناءاللہ نے ان سے

شرح جامی اور قطبی تک کتابیں پڑھیں۔ بعدازاں آپ کشاں کشاں مولانا حافظ عبدالمنان وزیرآبادی کی خدمت میں وزیرآباد پہنچے اور بڑے ذوق وشوق سے حدیث شریف پڑھی۔۱۸۸۹ء میں حدیث کی سندحاصل کی۔تعلیم حاصل کرنے کے بعدمولانا ثناءاللہ کی تشنگی بھی بڑھ رہی تھی اوروہ دین کے ہر چشمہ سے فیض یاب ہونا چاہتے تھے۔وہ وزیرآباد سے دہلی روانہ ہوئے جہاں نذیرحسین محدث دہلوی نے مسندعلم آراستہ کررکھی تھی۔میاں نذیرحسین،سرتاج العلماءاوراہل حدیث کے ممتازترین عالم تھے وہ کتب ستہ (یعنی حدیث کی چھ مستند کتابیں) سیکڑوں بار پڑھا چکے تھے۔مولانا ثناءاللہ نے میاں نذیرحسین سے استفادہ کیا۔دہلی سے مدرسہ مظاہرالعلوم سہارن پورتشریف لے گئے جہاں حدیث کی سندحاصل کی۔

اب مولانا کی تعلیمی منزل دیوبندتھی۔حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن دارالعلوم دیوبند کےصدرمدرس تھے۔حضرت شیخ الہند بےحدلطف وکرم سے پیش آئے اورانھیں مختلف دینی کتابیں پڑھائیں۔دیوبندمیں اُنھوں نے حدیث کی سماعت بھی کی دیوبند سے کان پورکارُخ کیا۔ کان پور میں مولانا احمدحسن سے استفادہ کیا۔۱۸۹۳ء میں فارغ التحصیل ہونے کے بعدمولانا ثناءاللہ امرتسرتشریف لائے۔

مولانا ثناءاللہ امرتسر سے ایک رفوگر کی حیثیت سے نکلے اوراب ایک جلیل القدرعالم کی حیثیت سےامرتسرمیں جلوہ آراہوئے۔ان کے عالم باعمل استادمولانا احمداللہ کےعلمی کمالات سے خوب آگاہ تھے۔ اُنھوں نے مدرسہ تائیدالاسلام امرتسر کے لیےمولانا کی خدمات بطور مدرس حاصل کیں۔مدرسہ میں وہ بڑے کامیاب استادثابت ہوئے ان کی شہرت دوسرےشہروں تک پہنچی ۱۸۹۸ء میں وہ مدرسہ اسلامیہ ملیر کوٹلہ میں صدرمدرس کی حیثیت سےتشریف لے گئےملیرکوٹلہ میں دو سال کام کیا تھا کہ آپ کی طبیعت ملازمت کے بندھنوں سے گھبراگئی اوراُنھوں نے ملازمت ترک کردی۔وہ ایک شاہین تھے کھلی فضامیں پرواز کرنے کے خواہش مند تھے ان کی رائے میں شاہین کے لیے آشیاں بندی کارِذلت تھا۔اُنھوں نے ملازمت کی سنہری زنجیروں کو توڑدیااورکھلی فضامیں پرواز کرنے کافیصلہ کیا مولانا کوئی سرمایہ داریا جاگیردارنہ تھے کہ ملازمت ترک کردینے کے باوجودوہ گزارہ کرسکتے۔ مگرمولانا کی عہدآفریں شخصیت مہم جوئی اورجرأت مندی سے مال مال تھی۔مالیرکوٹلہ سےواپس آئےتو اُنھوں نےتحریروتقریراورمناظرہ کے دشتِ پرخار میں قدم رکھا۔مولانا ثناءاللہ کوقرآن پاک اور حدیث شریف سے بے پناہ عشق تھا۔اُنھوں نے اپنی زندگی قرآنِ پاک اور حدیث شریف کی تعلیم اورتبلیغ کے لیےوقف کردی۔مولانا ثناءاللہ نے حیاتِ مستعار کاایک ایک لمحہ قرآن اورحدیث میں صرف کیا یہ دینی خدمت ان کے لیےسعادت کاسبب اورنجات کاذریعہ ہوگی۔

میدان مناظرہ کےشہسوار:

مولانا ثناءاللہ جس زمانہ میں تحصیل علم کررہے تھےعیسائی اورآریہ سماج اسلام پریلغارکررہے تھے۔انگریز کاہندوستان میں غلبہ ہواتواس نےمسلمانوں کواپناحریف جان کرفناکرنے کی کوشش کی یہ داستان بڑی دردناک ہے۔انگریزوں نے مسلمانوں کواقتدار سےمحروم کرکےان کی دنیاچھین لی۔انگریز اور ہندوؤں نےمفلس مسلمانوں کی رگِ حیات سےخون کاآخری قطرہ نکالنے سےبھی دریغ نہ کیا۔مسلمانوں کی دنیا چھیننے کے بعدانگریز نےمسلمانوں کودین کی دولت سےبھی محروم کرنا چاہا۔ ہندوستان میں جوق درجوق پادری آئے اوراُنھوں نے اسلام پرتابڑتوڑ حملےشروع کردیےانگریز کےظلم وتشدداورمغربی تہذیب کی فاتحانہ یلغار نےمسلمانوں کومرعوب اوران کی نگاہوں کوخیرہ کردیاتھا۔ اب عیسائی مبلغوں کی آمدہوئی تو مسلمان گھبراگئے۔عیسائی پادریوں کو اربابِ حکومت کی سرپرستی حاصل تھی۔اس نازک دور میں دین محمدی ﷺ کے متوالے اُٹھے اور اُنھوں نے عیسائی پادریوں کی دعوتِ مبارزت کوقبول کیااوراس طرح مناظروں کالامتناہی سلسلہ شروع ہوا۔ انگریزوں کے اشارۂ ابروپرسوامی دیانند نےآریہ سماج کی بنیادرکھی۔ برطانوی حکومت کو یہ خدشہ تھا کہ اسلام میں اس قدرمحاسن اورخوبیاں

ہیں کہ ہندو کہیں اسلام کے حلقہ بگوش نہ ہو جائیں۔ انگریزوں کی آمد سے قبل ہندوؤں اور مسلمانوں میں حاکم اور محکوم کی آویزش تھی۔ مسلمان بادشاہ اسلام کے حقیقی نمائندہ نہ تھے بلکہ ملوکیت کے علَم بردار تھے اور وہ اپنی سیاسی اغراض و مقاصد کے پیش نظر تبلیغ کے خواہش مند نہ تھے۔ انگریزوں نے آریہ سماج کی سرپرستی کی۔ آریہ سماج نے ایسے مذہبی اصول متعین کیے جو انوکھے نرالے آسان اور حالاتِ حاضرہ کے مطابق تھے۔ اُنھوں نے بتوں کی عبادت ترک کردی۔ اس طرح ہندوؤں نے اسلام کی بجائے آریہ سماج کا رُخ کیا آریہ سماجیوں نے بھی اسلام پر یلغار کردی۔ گویا یہ مسلمانوں کے خلاف آریوں اور عیسائیوں کا متحدہ محاذ تھا۔ دونوں فریق دولت مند تھے۔ عیسائیوں کا پشت پناہ مستشرقین کا گروہ تھا۔ عیسائی پادری یہ اعتراضات مناظروں میں دہراتے مسلمانوں کے لیے یہ دقت تھی کہ اُنھوں نے انجیل یا ویدوں کو دیکھا بھی نہ تھا اور اس طرح تقابلی مطالعہ نہ کیا تھا۔ اس نازک دور میں چند مردانِ خدا آگے بڑھے۔ اُنھوں نے انجیل، تورات اور دیگر کتابوں کا مطالعہ کیا۔ عبرانی، لاطینی اور انگریزی زبانوں کو سیکھا۔ ڈاکٹر وزیر خاں نے تو ہندوستان کی جنگ آزادی ۱۸۵۷ء سے قبل انگلستان کا سفر کیا۔ اور اس طرح ضروری معلومات سے لیس ہو کر یہ مردانِ خدا میدانِ عمل میں اُترے۔ ان کے سرخیل تو حضرت شاہ عبدالعزیز تھے۔ جن کا وجود مسلمانوں کے لیے متاعِ فخر و ناز تھا۔ مولانا رحمت اللہ کیرانوی، ڈاکٹر وزیر خاں، مولانا فضل حق خیر آبادی، مولانا محمد قاسم نانوتوی نے اس سلسلہ میں جو خدمات سرانجام دیں وہ ہماری علمی تاریخ کا سنہرا باب ہے۔ اُنھوں نے بارہا عیسائیوں اور آریہ سماجیوں کو شکست فاش دی۔ مگر شکست کھانے کے باوجود عیسائیوں اور آریہ سماجیوں نے مناظروں کا سلسلہ جاری رکھا۔ اب ہر مسلمان عالم کے لیے لازمی تھا کہ وہ ان اسلام دشمن عناصر کے خلاف ضروری معلومات حاصل کرے کہ ضرورت کے وقت مناظرہ کر سکے۔ مولانا ثناء اللہ طالب علمی کے دور ہی سے مناظروں سے دل چسپی رکھتے تھے۔ وہ مناظروں میں جاتے اور گاہِ گاہِ بحث میں بھی شریک ہو جاتے۔ عیسائیوں اور آریہ سماجیوں کی کتابوں کا مطالعہ بھی کیا۔ مولانا فن مناظرہ کے امام تھے۔ اپنے علم و فضل نکتہ آرائی، خطابت طنز و مزاح شگفتہ مزاجی، برجستہ جواب، برمحل اشعار اور ادبی لطائف کے استعمال سے ہمیشہ حریف پر غالب آئے۔ مناظرہ میں جوش و خروش یا غیض و غضب کا اظہار نہ کرتے بڑے سکون سے جواب دیتے اور ان کے لبوں پر تبسم رقص کرتا۔ اُنھوں نے دین مبین کی تائید وحمایت میں سیکڑوں مناظروں میں حصہ لیا اور خدا کے فضل و کرم سے ہمیشہ فتح و نصرت سے ہم کنار رہے۔ مناظروں کی ہندوستان بھر میں دھوم تھی۔ جب بھی کہیں مناظرہ ہوتا تو وہاں کے مسلمان مولانا ثناء اللہ کو دعوت دیتے اور وہ مسلمانوں کے نمائندہ کی حیثیت سے عیسائیوں اور آریہ سماجیوں پر غالب آتے اُنھوں نے قادیانیوں سے بھی مناظرے کیے انھیں فاتح قادیان سے موسوم کیا جاتا ہے۔ مولانا نے مخالفین کی امہات الکتب کا مطالعہ بھی کیا تھا۔ وہ ان کتابوں کے حوالے پیش کر کے لاجواب اور ششدر کر دیتے۔ مولانا ہمیشہ مختصر تقریر کرتے دقیق سے دقیق مسئلوں کو عام فہم انداز میں بیان کرتے۔

لاجواب خطیب:

مولانا ثناء اللہ صرف مناظروں ہی کے مردِ میدان نہ تھے بلکہ بہت بڑے خطیب بھی تھے۔ جلسوں میں تقریر کرتے تو مجمع کو لوٹ لیتے۔ اُنھوں نے اسلامی اجتماعات میں بے شمار تقریریں کیں۔

مولانا ثناء اللہ خوش نوا خطیب ہونے کے علاوہ اہل قلم بھی تھے اور ادیب اور صحافی بھی تھے اُنھوں نے ۱۹۲۰ء سے صحافت کا آغاز کیا اور قیام پاکستان تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ گویا مولانا نے پینتالیس ۴۵ سال سے زیادہ عرصہ تک صحافت کی۔ ۱۹۰۰ء میں امرتسر میں اخبار ''مسلمان'' نکالا۔ اس اخبار میں عیسائیوں اور آریہ سماجیوں کے اسلام پر اعتراضات کے مدلل جوابات ہوتے۔ اخبار مسلمان بے حد مقبول ہوا ۱۹۰۳ء میں مولانا نے اپنے مسلک کی اشاعت کے لیے اخبار اہل حدیث جاری کیا۔ یہ ہفت روزہ جولائی ۱۹۲۷ء کے آخری ہفتہ تک

باقاعدگی سے شائع ہوتا رہا۔ اخبار میں اداریے خود لکھتے اور مختلف سوالات کے جواب دیتے۔

مولانا ثناءاللہ نے کئی کتابیں بھی تالیف کیں۔ جنھوں نے قبول عام حاصل ہوا۔ اُنھوں نے ''حق پرکاش'' اور ''مقدس رسول'' کے علاوہ قرآن پاک کی تفسیریں بھی لکھیں۔ تفسیر القرآن بکلام الرحمان عربی میں ان کی یگانہ اور لاجواب تفسیر ہے۔ جس میں قرآن پاک ہی سے قرآنِ پاک کی تفسیر کی گئی ہے۔ اس تفسیر کو عالم اسلام میں بے حد پسند کیا گیا۔

مولانا ثناءاللہ نے مثالی کتب خانہ اور ثنائی برقی پریس بھی قائم کیا۔ کتب خانہ اور پریس نے مولانا کے لیے ذریعہ معاش کا کام دیا۔ اس طرح وہ دینی کام فی سبیل اللہ انجام دے سکے۔

مولانا ثناءاللہ بڑے بردبار، خلیق، مہمان نواز اور جفاکش انسان تھے۔ ان کی ذات مشرقی تہذیب کا دل آویز پیکر تھی۔ ان کا دسترخوان وسیع تھا اور وہ مہمانوں کی بڑی تواضع کیا کرتے تھے۔ بیماروں کی عیادت کے لیے خود تشریف لے جاتے۔

مولانا ثناءاللہ کی زندگی کا ایک درخشاں اور تابناک پہلو اتحاد اُمت کے لیے ان کی مسلسل سعی تھی۔ مولانا ثناءاللہ کو مسلمانوں میں فرقہ پرستی اور گروہ بندی سخت ناپسند تھی۔ وہ مسلمانوں کو ہمیشہ اتحاد و اتفاق کی تلقین کرتے۔ مولانا مختلف فرقوں کے مسلمانوں کو قرآنِ پاک کی آیات اور سرکار دو عالم ﷺ کے ارشادات سناتے جن میں مسلمانوں میں اتحاد واتفاق اور یگانگت کی تلقین ہوتی۔ مولانا نے اتحاد اسلامی کے کئی اجتماعات میں شرکت فرمائی۔ ۱۹۲۱ء میں سلطان ابن سعود نے حضرت سید محمد امین الحسینی مفتی اعظم فلسطین کی دعوت پر مکہ معظّمہ میں مؤتمر اسلامی کا اجلاس بلایا۔ جس میں عالم اسلام کے اکابر شریک تھے۔ مسلمانوں کی تاریخ میں اپنی نوعیت کا یہ پہلا اجتماع تھا۔ مولانا ثناءاللہ کو بھی اس اجتماع میں شامل ہونے کا فخر حاصل ہوا۔ اُنھوں نے اس اجلاس کی کارروائیوں میں حصہ لیا اور مختلف تجاویز پیش کیں۔ عالم اسلام کے اکابر مولانا کے علم وفضل، نکتہ رسی اور فہم وفراست سے بے حد متاثر ہوئے۔

اُنھوں نے اپنی تمام تر صلاحیتوں کو ملت کے لیے صرف کیا۔ شامِ زندگی میں انھیں حادثات سے دوچار ہونا پڑا۔ امرتسر میں فسادات کا آغاز ہوا۔ ہندوؤں اور سکھوں نے بربریت کا مظاہرہ کیا مسلمانوں کے خون سے امرتسر کی سرزمین لالہ زار ہوگئی۔ مولانا تو ضعیف ہو چکے تھے۔ ان کے فرزند دل بند مولوی عطاءاللہ کو چہ بھر کے مسلمانوں کی حفاظت کے لیے پہرا دیا کرتے تھے رمضان المبارک کے آخری ہفتہ ۱۳راگست ۱۹۴۷ء کو گلی کی حفاظت کررہے تھے کہ غیر مسلموں نے ان پر بم پھینکا جس سے مولوی عطاءاللہ شدید زخمی ہوگئے۔ حضرت مولانا چند رفقاء کی مدد سے عطاءاللہ کی مدد کو روانہ ہوئے مگر راستے ہی میں مولوی عطاءاللہ نے جامِ شہادت نوش کیا۔ اور مولانا مردِ صابر کی مثال تھے وہ تسلیم ورضا کی منزل میں تھے۔ اُنھوں نے اپنے اکلوتے فرزند کی شہادت پر حیرت انگیز صبر وسکون سے کام لیا۔ ان کا لختِ جگر راہ حق کا شہید تھا۔

تقسیم ملک کے وقت آپ اپنا گھر بار چھوڑ کر خالی ہاتھ نکلے گھر میں ہزاروں روپوں کا سامان، زیورات اور دیگر سامان تھا انھیں سب سے زیادہ صدمہ نایاب اور قیمتی کتابوں کا تھا اُنھوں نے قرآن وسنت کے بارے میں سالہا سال کی سعی وکاوش کے بعد جو ریزے ریزے جمع کیے تھے یہ کتب خانہ وحشیوں کی دست برد کا شکار ہوگیا۔ ابوالوفاء مولانا ثناءاللہ نے چودہ اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان کی جانب ہجرت کی۔ آپ لاہور اور بعد ازاں گوجرانوالہ رہے۔ مستقل قیام سرگودھا میں ہوا۔ مولانا مہاجر تھے بے سروسامانی کا عالم تھا کوئی حرفِ شکایت لب پر نہ لائے اُنھوں نے امرتسر میں پریس، کتب خانہ آٹھ دس مکانات اور شہر میں دکانیں چھوڑی تھیں مگر اُنھوں نے پاکستان میں الاٹمنٹ کی کوئی کوشش نہیں کی اُنھوں نے اپنی خودی اور غیرت مندی کو برقرار رکھا۔ سرگودھا میں پریس اور مکان مل گیا۔ اسی پر اکتفا کیا وہ سرگودھا میں دینی خدمات کا مرکز قائم کرنا چاہتے تھے مگر بیمار ہوگئے اور ۱۵ مارچ ۱۹۴۸ء کو انتقال کر گئے۔ ابوالوفاء مولانا ثناء اللہ کی وفات پر پاکستان، ہندوستان اور اسلامی ممالک میں گہرے رنج وغم کا اظہار کیا گیا۔

نقطۂ نظر

دنیا عیسائیت کی زد میں

حافظ عبدالماجد، متعلم جامعہ سلفیہ، فیصل آباد

اس وقت دنیا بہت سے بحرانوں میں مبتلا ہے۔ بے شمار محاذوں پر الگ الگ نوعیت کی جنگ جاری ہے۔ یہ جنگ عسکری محاذوں سے لے کر سیاسی، معاشرتی، اقتصادی اور مذہبی محاذوں تک پھیل چکی ہے۔ان جنگوں میں سب سے زیادہ قدیم جنگ مذہب کے نام پر لڑی جا رہی ہے۔اور اس جنگ میں دنیا کے بڑے بڑے ممالک برسرپیکار ہیں۔اس جنگ کی انفرادیت یہ ہے کہ اس میں اسلام ایک طرف اور دوسرے تمام مذاہب عالم ایک طرف ہیں۔ یہاں یہ بات بھی ذہن نشین رہے کہ یہودیت چونکہ تبلیغی مذہب نہیں اس لیے اس کی تمام تر کوششوں کا دائرہ کار دین اسلام میں فکری سطح پر شکوک وشبہات کا بیج بونا اور دشمنانِ اسلام کی اعانت ہے۔

اس وقت مذاہب کی اس جنگ میں عیسائیت امریکا اور برطانیہ کی سرپرستی میں بین الاقوامی سطح پر کام کر رہی ہے۔اور اسلامی دنیا میں انتہائی خاموشی کے ساتھ اس محاذ پر ڈٹی ہوئی ہے۔ بلکہ اب تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ کھل کر سامنے آگئی ہے۔کیا یہ حقیقت نہیں کہ پچھلے چند سالوں سے پاکستان میں ''شفاعیہ اجتماعات'' کے نام سے ضعیف الاعتقاد مسلمانوں کو عیسائیت کا شکار بنایا جا رہا ہے......!!!

امریکا اور یورپ میں پھیلے ہوئے عیسائیت کے بڑے بڑے مراکز نے اکیسویں صدی میں نصرانیت کی ترویج کے لیے انتہائی اہم منصوبہ بندی کی ہے اور اس منصوبہ بندی وکامیابی سے ہم کنار کرنے کے لیے ۹۲۰ ملین ڈالر صرف کرنے کا تہیہ کیا ہے۔

اکیسویں صدی میں عیسائیت کے غلبے کے لیے ہونے والی منصوبہ بندی کا آغاز ۱۹۷۸ء میں ایک مخصوص کانفرنس کے ذریعے کیا گیا تھا۔ یہ کانفرنس شمالی امریکا کے علاقے ''نوازن'' میں ہوئی تھی۔ اس کانفرنس میں نصرانیت کے متعلق مختلف عقائد اور کلیساؤں کی نمائندگی کرتے ہوئے ۲۰۰ کے لگ بھگ نمائندوں نے شرکت کی۔اس کانفرنس میں جو خاص بات سامنے لائی گئی وہ یہ تھی کہ تمام دنیا میں اس وقت کتنے مسلمانوں کو عیسائی بنایا گیا ہے۔اس سلسلے میں جب انھیں حوصلہ افزا رپورٹ موصول ہوئی تو اُنھوں نے اس کانفرنس میں آئندہ کے لیے مسلمانوں میں عیسائیت کی تبلیغ کے لیے جدید طریقہ کار پر غور کیا۔

چنانچہ اکیسویں صدی میں ''سموئیل زویمر'' کے نام سے ایک ادارہ تشکیل دیا گیا۔ یہ ادارہ امریکا میں ہے اور اس کا کام صرف اور صرف یہ سوچنا ہے کہ مسلمانوں میں عیسائیت کی تبلیغ کا کام کس انداز میں کیا جائے۔ اس کے لیے یہ ادارہ نت نئے طریقے وضع کر کے عیسائیت کے مراکز کو فراہم کرتا ہے۔تاکہ بالخصوص مسلمانوں کی نسل نو کے عقائد ونظریات شکوک وشبہات کا شکار ہو سکیں۔

مسلمانوں میں فروغ عیسائیت کے منصوبے کو ۱۹۸۵ء میں حتمی شکل دے دی گئی تھی۔ پھر اس پر تحقیقی بنیادوں پر کام بھی کیا گیا۔جس کی تفصیلی رپورٹ ۱۹۹۸ء کے آخر میں شائع ہوگئی۔اور اس رپورٹ کی روشنی میں مزید سفارشات بھی پیش کی گئیں جو امریکا میں عیسائیت کے ایک ادارے نے شائع کیں۔اور اس کا زیادہ تر حصہ امریکی ریاست ورجینیا میں ''ریجنٹ یونیورسٹی'' کے شعبہ مذہبی لٹریچر کے استاد ڈیوڈ باریٹ نے تحریر کیا تھا۔ اس رپورٹ کے اندر لکھا یہ تھا کہ دنیا میں عیسائیت کی تبلیغ کے لیے حالات انتہائی موافق ہیں۔ڈیوڈ باریٹ کے

(باقی صفحہ ۲۳ پر ملاحظہ فرمائیں)

تبصرۂ کتب

تبصرے کے لیے کتاب کے دو نسخوں کا آنا ضروری ہے

روسی مسلمانوں کے تین سوال

مصنف: محمد سلطان المعصومی المکی

ترجمہ: مولانا مختار احمد ندوی

ضخامت: ۱۰۲ صفحات

قیمت: ۶۰ روپے

ناشر: طارق اکیڈمی، سلیمی چوک، فیصل آباد

فون: 041-8715768

تبصرہ نگار: محمد سلیم چنیوٹی

اسلام ایک سچا اور عالم گیر مذہب ہے۔ مگر المیہ یہ ہے کہ حقانیتِ اسلام سے متاثر ہونے والے لوگ جب مسلمان ہونا چاہتے ہیں تو انھیں یہ سمجھ نہیں آتی کہ وہ کون سے مسلمان بنیں، حنفی مسلمان، شافعی مسلمان، حنبلی مسلمان یا مالکی مسلمان!

اسی طرح کا واقعہ چند جاپانیوں کو پیش آیا جب انھوں نے اسلام کی سچی تعلیمات کو قبول کیا اور ٹوکیو کی اسلامی جمعیت کے افراد سے اپنے عملی ارادے کا اظہار کیا تو وہ فقہی گروہوں کے وجود سے اور گروہ بندیوں کی صورت حال جان کر سوچ میں پڑ گئے۔ وہاں چند روسی مسلمانوں نے بھی ان سے گفتگو کی اور وہاں کے عالم دین جناب محمد سلطان المعصومی سے تین سوال کیے، اُنھوں نے جو جوابات عنایت فرمائے اسے کتابی شکل میں طارق اکیڈمی نے شائع کر دیا ہے۔ ان کے سوالات یہ تھے:

(۱) ایمان اور اسلام کی حقیقت کیا ہے؟ (۲) مذہب کے معنی کیا ہیں اور مذہب کسے کہتے ہیں؟ (۳) کیا ایک مذہب (مسلک) کی پابندی ضروری ہے؟

ان سوالات کے سیر حاصل جوابات خود بھی پڑھیے اور دوسروں کو بھی پڑھائیے۔ اصل اسلام کی تعلیمات کو جاننے کے لیے اور فرقہ واریت کے خاتمے میں یہ کتاب مدد ومعاون ہوسکتی ہے۔



امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ

مصنف: علامہ محمد یوسف کوکن عمری رحمہ اللہ

ضخامت: ۷۸۰ صفحات۔ (مضبوط جلد، خوبصورت کاغذ وطباعت)

ملنے کا پتا: مکتبہ اسلامیہ، غزنی سٹریٹ، اُردو بازار، لاہور

ناشر: نعمانی کتب خانہ

تبصرہ نگار: محمد سلیم چنیوٹی

مجدد دین وملت، امام المفسرین، شیخ الاسلام والمسلمین تقی الدین ابو العباس احمد بن شہاب الدین عبدالحلیم معروف بہ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کسی تعارف وتبصرے کی محتاج شخصیت نہیں۔

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ عالم اسلام کی وہ بابرکت ہستی ہیں جنھوں نے اپنی سڑسٹھ سالہ حیاتِ مستعار میں اسلام اور اہل اسلام کی وہ خدمت سرانجام دی کہ ان کا نام تا قیامِ قیامت آنے والی نسلوں کی یقیناً راہنمائی کرتا رہے گا۔

امام موصوف نے اپنی زندگی میں بڑے بڑے معرکے سر کیے، اُنھوں نے ملتِ اسلامیہ کے پژمردہ جسم میں ایسی تازہ روحانی قدریں زندہ کردیں کہ وہ خود بھی اپنی زبان وقلم، تیر وتلوار اور جہد وجہاد کی منزلیں طے کرتے چلے گئے۔ علوم اسلامیہ میں رائج بعض ایسے

مفاسد کی نشان دہی کی کہ اپنے وقت کے مقلدین مذاہب سے ان کا ہمیشہ مقابلہ رہا۔ انھیں شدید مخالفت سے بھی واسطہ رہا، لیکن امام موصوف اپنی دھن کے پکے رہے اور مسلسل اپنا دینی فریضہ بڑی جرأت سے سرانجام دیتے رہے۔

علمی و تعلیمی سطح پر شیخ موصوف کو جہاں مخالفین تنگ کرتے تھے وہاں بعض مخلص اور ذی وقار اہل علم حضرات کی طرف سے ان کی عزت افزائی اور قدر و منزلت بھی کی گئی۔

زیرتبصرہ کتاب حضرت الامام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے مفصل حالات زندگی پر مشتمل ہے۔ برصغیر کے ممتاز اہل علم علامہ محمد یوسف کوکن عمری رحمہ اللہ کے قلم گوہر بار سے مذکورہ کتاب مرتب کی گئی ہے۔ اب تک امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی زندگی پر کئی ایک اصحاب علم و فن اپنی تصانیف و تالیفات لکھ کر انھیں خراجِ عقیدت پیش کر چکے ہیں۔ کئی ایک نے امام موصوف کی زندگی کے مختلف زاویوں روشنی ڈالی ہے۔ مگر کتاب زیرنظر نے امام موصوف کے کئی ایک گوشے اور ان کی تگ و دو پر سیر حاصل مواد پیش کیا ہے، جو یقیناً ایک پرکیف اور دل آویز ستاویز ہے۔

زیرتبصرہ کتاب درج ذیل خصوصیات کی حامل ہے:

- امام موصوف کی جائے پیدائش حران شہر جو ملکِ شام کا ایک مشہور شہر ہے کی تاریخ اور اس میں ہونے والے مشہور واقعات کا تذکرہ۔
- امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے آباء و اجداد کا تذکرہ اور ان کے خاندانی حالات، ابن تیمیہ کی وجہ تسمیہ۔
- امام صاحب کی تعلیم و تربیت، شیوخ حدیث، اساتذہ فن اور دیگر تعلیمی سرگرمیاں۔
- درس و تدریس اور تفسیر قرآن و فتویٰ نویسی و طرز تفہیم و تعلیم کا تذکرہ
- تاتاریوں اور دیگر مفسدین کے خلاف جہاد۔
- رسوم و رواج اور شرک و بدعات کی تردید۔
- اپنے آپ کو فقراءِ رفاعیہ کہلانے والوں کے ساتھ امام موصوف کے مناظروں کی روداد۔
- فتنہ عقائد یعنی استواء علی العرش، فتنہ خلق قرآن اور دیگر مخالفین سے تحریری و تقریری مقابلے۔
- نام نہاد اہل تصوف پر تنقیدی مساعی، صوفیوں کے مختلف گروہوں کی نشان دہی اور تعارف۔
- یہودیت اور نصرانیت کی تردید، اناجیل اربعہ کی حیثیت، مسیحی عقائد اور اسلام کے خلاف ان کی تحریکوں کا تذکرہ۔
- فقہی اجتہادات، زمانہ تابعین، تقلید کی ابتدا اور ترقی، شخصی تقلید کے خلاف طبعی میلانات، ایک مجلس کی تین طلاق اور دیگر مباحث علمیہ۔
- ردّ شیعیت، مسئلہ خلافت و امامت، شیعہ و سنی کشمکش اور دیگر شیعی تصنیفات و عقائد کا ردّ وغیرہ۔
- علوم عقلیہ پر تنقید اور اُصولِ دین کی وضاحت و تعریف۔
- امام موصوف پر سختیوں کی ابتدا اور قید میں وفات۔

اس کے علاوہ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے ذاتی اوصاف و کمالات، تصنیفات، ان کے ارشد تلامذہ اور ان کی دین و ملت کے لیے کی گئی خدمات کا دل نشین اور باحوالہ تذکرہ شامل کتاب ہے۔



علی الصباح

پو پھٹتی ہے مسجد میں اذاں گونج رہی ہے
تکبیر خداوندِ جہاں گوج رہی ہے
توصیف و ثنا ہے گل و لالہ کی زباں پر
تلقین شہ کون و مکاں گونج رہی ہے
ہر شاخِ چمن نور کے تڑکے کا علم ہے
ہر ذرۂ گیتی کی زباں گونج رہی ہے
ہے نغمہ توحید موذّن کی صدا میں
یا غیرتِ شمشیرِ رواں گونج رہی ہے
ہے گنبدِ افلاک میں آوازۂ فطرت
یا جادۂ منزل پہ اذاں گونج رہی ہے
وہ نالۂ شب تاب کہاں سو گیا جا کر
یہ آہِ سحر تاب کہاں گونج رہی ہے
کیا شے یہ ہنسی پردۂ مینا سے نکل کر
ٹوٹی ہوئی توبہ کی فغاں گونج رہی ہے

(شورش کاشمیری)